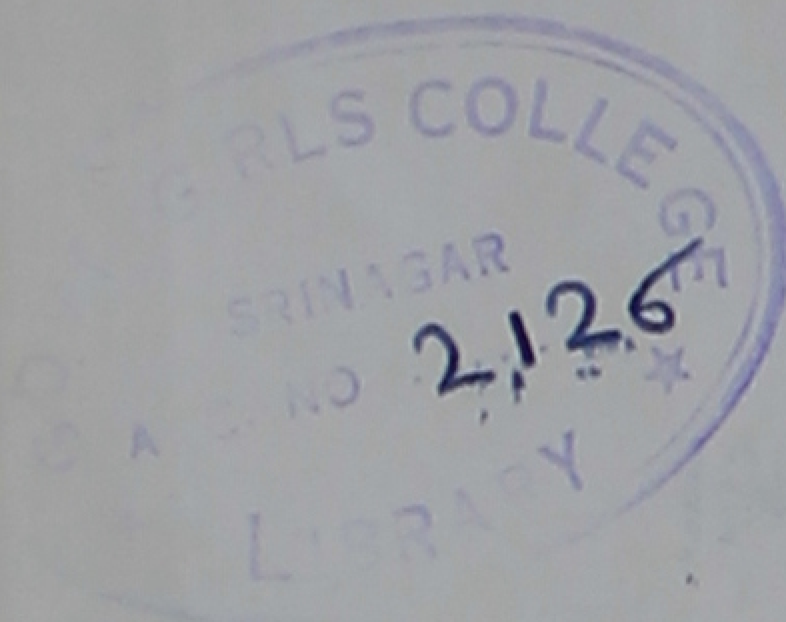
تعلیمی مضامین

تعلیمی مضامین

بشیر احمد ہاشمی، ایم اے، ایم ای ڈی
پنجاب ایجوکیشنل سروس



رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز
ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور

قیمت ۱عصر ۸ر



باہتمام لالہ موتی رام مینجر مفید عام پریس واقع چیٹرجی روڈ لاہور میں چھپا - اور
رائیصاحب لالہ سوہن لال ایم ایل - اے پروپرائٹر رائیصاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز نے لاہور سے شائع کیا

صوبۂ پنجاب کے سب سے بڑے تعلیمی خدمتگزار

آنریبل میاں عبدالحی صاحب

وزیرِ تعلیمات پنجاب

کی خدمتِ گرامی میں

ھاشمی

مضامین کی فہرست

زبان

متفرق

پیش لفظ

تعلیم کے موضوع پر کسی تصنیف کو پیش کرتے ہُوے، مجھ سے بے بضاعت کو بھی تامل نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ تصنیف بلند پایہ ہے، بلکہ یہ کہ ہندوستان کی زبانوں میں اس موضوع پر کتابوں کا فقدان ہے۔ ہمارے لٹریچر میں تعلیم، علم الاخلاق کی کتابوں کے ایک جُز کی حیثیت سے پیش کی جاتی رہی ہے، لیکن کسی کتاب کا مستقل عنوان نہیں بنی۔ موجودہ زمانے میں بھی سوائے گنی چُنی کتابوں کے اس موضوع پر کتابیں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ جیسے ہیچمیرز کو اپنے چند تعلیمی مضامین کا مجموعہ شائع کرنے کی جسارت ہوئی۔

مَیں ایک معلّم ہوں اور میرے نزدیک معلمی کا پیشہ نہایت ہی معتبر اور قابلِ عزّت ہے۔ بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ معلّمی کے پیشے کو اولیّت کا فخر حاصل ہے،

گویا یہی وہ پیشہ ہے، جو تخلیق و تنظیم عالم کے ساتھ ساتھ وجود میں آیا۔ دنیا نے اب تک جس قدر ترقی اور عروج حاصل کیا ہے، وہ معلّمین کی پیہم کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے اور یہ ایسی بات ہے کہ معلّمین اس پر جتنا بھی فخر کریں بجا ہے، لیکن ان گرانبہا خدمات کے باوجود بیچارہ معلّم کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہوا ہے۔ دن بدن اس کا معیارِ زندگی اور اس کی سماجی حیثیت پست ہوتی جا رہی ہے۔ آخر اس بداقبالی کا سبب کیا ہے؟ سماج کی احسان فراموشی اور کور ذوقی؟ ممکن ہے یہی بات ہو، لیکن اس بداقتداری کی ذمّے داری معلمین پر بھی عاید ہوتی ہے۔ ہم خود اپنے فرائض کو عامی اور آسان سمجھنے لگے ہیں۔ فکر اور خلوص ہماری پیشہ ورانہ زندگی میں کوئی جگہ نہیں رکھتا۔ حالانکہ یہ ضروری ہے کہ 'فکر' ہماری ذہنی زندگی کی عادت اور خلوص ہماری جذباتی زندگی کا شیوہ بن جائے۔

تب و تابے کہ باشد جاودانہ سمندِ زندگی را تازیانہ
بہ فرزنداں بیاموز ایں تب و تاب کتاب و مکتب، افسون و فسانہ (اقبال)

اِن مضامین کے ایک حصّے، یعنی 'معلّم' میں اسی شاہراہ پر چلنے اور چلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ خدائے منعم کے الطاف سے کیا بعید ہے کہ میری دلی مراد بر آئے اور ہم معلّمین کی زندگی پھر فکر اور خلوص کی زندگی بن جائے۔

اس مجموعے میں تین مضمون زبان پر ہیں۔ محتاط اور زمانہ شناس لوگ

زبان کے مسئلے کو بے انتہا نازک، مشکل اور خدا جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ بہر حال
مَیں نے احتیاط اور زمانہ شناسی کی قیود سے بے پروا ہو کر خالص علمی نقطۂ نگاہ
سے جو کچھ عرض کیا ہے، وہ قابلِ غور ہے۔

آخری دس مضامین کو متفرقات کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس عنوان کے تحت
میں مختلف قسم کے مضامین جمع ہیں، جن میں دورِ حاضرہ کی تعلیمی ترقیوں اور علمی
دلچسپیوں کو ملحوظ رکھتے ہُوے، چند اہم اور دلچسپ مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔
پڑھنے والوں کو غالبًا یہ خیال ہو کہ ان مضامین میں سے اکثر و بیشتر تشنہ رہ گئے ہیں،
کیونکہ یہ مسائل کا حل پیش نہیں کرتے۔ دراصل مقصود بھی یہی ہے کہ مسائل پیش
کیے جائیں، اُن کی اُونچ نیچ کو واضح کر دیا جائے اور معاملہ معلمین اور عام حضرات
کے لیے چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ خود سوچ بچار کریں اور مخصوص حالات کے لیے
مخصوص نتائج مرتّب کر لیں۔

اس مجموعے کے بعض مضامین پنجاب ایجوکیشنل جرنل میں چھپ چکے ہیں۔
ایسے مضامین کی فراہمی، نیز پروف پڑھنے کی خدمات میرے عزیز شاگرد اور دوست
مرزا مقبول بیگ صاحب نے انجام دی ہیں، جس کے لیے مَیں احسانمند ہوں۔

گلمرگ۔ جولائی ۱۹۳۹ء

بشیر احمد ہاشمی

مُعلّم کی ضرورت

لفظ تعلیم علم سے مشتق ہے۔ علم کے معنی ہیں جاننا۔ اس لیے تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ بچے کو ہر پیش آنے والے معاملے سے آگاہی دی جائے اور چونکہ زندگی بے انتہا گوناگوں ہو گئی ہے، اس لیے معلّم کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ متعلم کو ہر آنے والے قضیے سے آگاہ کر سکے۔ لیکن یہ ضرور ممکن ہے کہ متعلم میں ایسے جسمانی اور دماغی خصائص پیدا کر دیے جائیں، جو اُس کی بقائے حیات اور ارتقائے حیات کے کفیل ہو سکیں۔ متعلّم کے لیے قدم قدم پر حفاظت، مدد اور ہدایت کی ضرورت رونما ہوتی رہتی ہے، اس لیے معلّم حقیقتاً ایک نگہبان ہے، جو ایک نشو و نما پانے والی شخصیّت کو بڑی احتیاط کے ساتھ زیرِ نظر رکھتا ہے۔

جسمانی اور دماغی پرورش اور تربیت حقیقی معنوں میں ماں باپ کے

آغوش اور گھر ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ یہ مضغہ گوشت یہیں وجود میں آیا ہے اور یہی مناسب جگہ ہے، جہاں اس کی اخلاقی تربیت بھی کی جائے۔ جیسے کہ مادری زبان کی ابتدا چند ٹوٹے پھوٹے کلمات اور غوں غاں سے شروع ہو جاتی ہے، اسی طرح اخلاقی تربیت کی ابتدا گھر کے ماحول، والدین کے طرزِ معاشرت اور طریقۂ زندگی کی ناقص نقل سے شروع ہو جاتی ہے۔ بچے کی ابتدائی فطری خواہشات اس کی جسمانی ضروریات کی طرح والدین کے مطالعہ اور مشاہدہ، تربیت اور تہذیب کی محتاج ہوتی ہیں۔ ناجائز خواہشات اور بے جا ضروریات کی بیخ کنی کرنا۔ عمدہ، مناسب اور نیک خواہشات کو ترقّی دینا اور انھیں بچے کے جذباتی ہیولیٰ میں حل اور پیوست کر دینا۔ نیک و بد، کذب و راستی میں تفریق اور پھر خُذ ما صَفا اور دَع ما کدر کی صلاحیت پیدا کرنا ابتدائی تعلیم کا مقصد ہے۔

بچہ اپنی ادنیٰ سی ادنیٰ ضروریات کے لیے بھی اپنے والدین کی توجہ کا محتاج ہوتا ہے اور یہ احتیاج ہی ابتداءً اسے اپنے سے بڑوں کے احکام کی تعمیل پر مجبور کرتی ہے۔ ہم میں سے یہ کس نے نہیں دیکھا کہ وہ ناسمجھ بچہ جس کی ضرورت محض حصول غذا ہے، اوروں کے مقابلے میں اپنی ماں یا انّا کے احکام کی تعمیل اور خواہشات کا زیادہ لحاظ کرتا ہے۔ اس لیے والدین کو چاہیے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔

اور ہر لمحہ بچے کی تربیت یعنی اُس کی سیرت کی تشکیل کو پیشِ نظر رکھیں۔ لیکن ممکن ہے، بعض والدین اسے پسند نہ کریں کہ بچے پر کسی قسم کا استبداد روا رکھا جائے۔ میں خود بھی شدت سے استبداد کے خلاف ہوں، مگر اس ابتدائی تربیت کو مستبدانہ نہیں سمجھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک بچے میں خود مناسب فیصلہ کرنے کی قوت پیدا نہیں ہو جاتی، اُس وقت تک بچے کی سیرت کی تشکیل والدین کا اوّلین فرض ہے، لیکن یہ دخل اندازی اس طرح ہو کہ جب بچہ سنِ شعور کو پہنچ جائے اور جوں جوں شعور کے مدارج طے کرتا جائے، وہ ان تمام ابتدائی احکام کو صرف احکام سمجھ کر ہی نہیں، بلکہ احسن اور مناسب طرزِ عمل سمجھ کر اختیار کرے۔

ہیئتِ اجتماعی کی منظم تقسیم خدمات پر مبنی ہے اور غالباً انسانی زندگی کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا کہ جب انسان بحیثیتِ مجموعی اپنی تمام ضروریات کا بذاتِ خود کفیل رہا ہو۔ ابتدائی زندگی میں محدود ضروریات کے ماتحت چند پیشہ ور ہی اپنے اپنے فن میں اکتساب کرتے تھے، لیکن جوں جوں ہماری ضروریاتِ زندگی بڑھتی گئیں، اُسی قدر نئے نئے پیشہ ور وجود میں آتے گئے۔ یقین کے ساتھ نہیں بتایا جا سکتا کہ کون سا پیشہ سب سے پہلے وجود میں آیا، مگر یہ یقینی امر ہے کہ معلمی کا پیشہ دنیا کے سب سے پرانے پیشوں میں سے ایک ہے۔ معلمی کے پیشے کے وجود میں آنے کی ظاہر اوجہ تو والدین کی سہل انگاری معلوم

ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی خود تربیت کرنے کے عوض معلم کی خدمات حاصل کر لیتے تھے، لیکن دراصل واقعہ یہ نہیں۔ اس کے وجوہ اور ہیں۔ ایک نوعمر بچے کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک جوان شخص کے تمام وقت کا صحیح مصرف کرسکے۔ بچے کو صرف اطلاعات حاصل کرنے اور موقعِ عمل پانے کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے اگر ہر ایک شخص صرف ایک یا دو بچوں کی تعلیم میں مصروف ہو جائے، تو حقیقتہً دنیا کی آبادی کا نصف سے زیادہ حصہ اپنی زندگی بمصداق 'کوہ کندن اور کاہ برآوردن' گزارتا نظر آئے۔

علاوہ ازیں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ معلمی کے لیے فنِ تعلیم کے اصول و قواعد سے شناسائی بے حد ضروری ہے اور اگرچہ اصول و قواعد جانے بغیر بھی ہر شخص بچوں کو تعلیم دے سکتا ہے، مگر ایسے معلم کی حیثیت میری نگاہ میں اس طبیب سے زیادہ نہیں، جو صرف اللہ کے بھروسے پر علم طب حاصل کیے بغیر، مریضوں کو بھکانے کے لیے آمادۂ علاج ہو جاتا ہے۔ اگر اس طبیب کے علاج سے مریض شفا پا جائے، تو سخت جان ہے اور اگر مر جائے، تو بالکل حق بجانب ہے۔ یہ افسوسناک امر ہے کہ ہندوستان میں اب تک جاہل معلّموں اور مردم کُش طبیبوں کی روک تھام کے لیے کوئی انتظامات نہیں کیے گئے، لیکن وہ وقت بعید نہیں کہ ہمیں اس کوتاہی کا احساس ہو جائے اور ہم ان دونوں جماعتوں کی مشقِ ستم سے آزاد ہو جائیں۔

موجودہ زمانے میں معلّم کی حیثیت اور رتبے میں کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی اور وہ عزت، جو اُسے ایک صدی پہلے ہندوستان میں میسر تھی، غالباً ابھی کچھ اور مدت تک حاصل نہ ہوگی۔ مَیں اس کساد بازاری کے متعلق کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا؛ مَیں صرف اس حقیقت کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ایسے معلموں کی سماج کو اشد ترین ضرورت ہے، جو بچے کی فطرت کا گہرا مطالعہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، جو درسی مضامین سے کما حقہ، واقف ہونے کے علاوہ اعلیٰ اخلاق سے متّصف ہوں اور جو بچے کی جسمانی اور دماغی بہبود کو ہمیشہ مدِ نظر رکھتے ہوں۔

مُعلّم کی زندگی کا مقصد

ابتدائے آفرینش سے تعلیم و تدریس نوعِ انسانی کا ایک ناگزیر مشغلہ اور ایک اہم فرض تسلیم کیا گیا ہے۔ زندگی کا وجود میں آنا اور اس کا بالیدہ ہونا، قوی تر ہونا، پھر مزید زندگی کو وجود میں لانے کے قابل بننا اور اس مزید زندگی کی بالیدگی و نشوونما کا ضامن ہونا، قانونِ حیات میں مضمر ہے، اس لیے ہر دَور کے انسان اپنی نئی نسل کی زندگی کو ضروریاتِ زمانہ سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش میں ہمیشہ مختلف ذرائع اور تدابیر اختیار کرتے رہے ہیں۔ نوعِ انسانی کی اس کوشش کا نام عرفِ عام میں تعلیم ہے۔

انسانی ضرورتوں میں خوراک، پوشاک اور سر چھپانے کی جگہ تین اولیں ضرورتیں ہیں۔ سب سے پہلے پیٹ کی فکر، پھر تن ڈھانپنے کی اور بعد ازاں کسی جگہ کو مسکن قرار

دہنے کی خواہش ہماری زندگی کے لیے لازمی ہیں ۔ یہ ضرورتیں جیسے آج موجود ہیں ، ایسے ہی ابتدائی انسان کے لیے موجود تھیں اور جیسے ابتدائی انسان کے مقابلے میں ہماری آج کی زندگی بے انتہا پیچیدہ اور گوناگوں ہے ، اسی طرح ہماری تعلیمی ضروریات بھی ابتدائی انسان کی تعلیمی ضروریات کے مقابلے میں ، پیچیدہ اور گوناگوں ہیں ۔ دورِ اولیں میں بچوں کی تعلیم کا اہم تریں جُز یہ تھا کہ ہر فرد جلد سے جلد اپنی خوراک آپ مہیا کرنے کے قابل ہو جائے ، اس لیے اس کا معلم ، جو بیشتر اس کا باپ ہوتا تھا ، اسے اولاً نباتاتی غذا سے آشنا کر دیتا تھا کہ جنگل کی جڑی بوٹی میں فلاں فلاں چیز تو کھائے جانے کے قابل ہے اور فلاں سے پرہیز لازم ہے ۔ نباتاتی غذا موسم کی نیرنگیوں سے اثر پذیر ہوتی ہے اور اس لیے اشرف المخلوقات کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ وہ اپنے سے کمتر مخلوق کا ہر ممکن استعمال کرے ۔ پرند اور چرند کا شکار کرے ، اسے غذا بنائے ، اس لیے معلم شکار کے ہنر کی تعلیم بھی دیتا تھا ۔ اسی معلم نے بعد کے دور میں جانوروں کو زندہ گرفتار کرنا ، انھیں پالنا پوسنا ، ان کی دیکھ بھال کرنا ، اُن سے غذا حاصل کرنا بھی سکھایا ۔

پوشاک اور مکان کے ضمن میں پتّوں سے ستر پوشی کرنا ۔ پھر اس سے بڑھ کر کھالوں سے لباس بنانا ، درختوں پر راتیں گزارنے سے بڑھ کر اینٹ پتھر سے کھوہ بنانا بھی ، آنے والی نسلیں معلموں کی معرفت سیکھتی رہی ہیں ۔ غرضکہ انسانی زندگی کا ہر شعبہ نت نئے نہج اور نت نئے اسلوب اختیار کرتا گیا اور معلم بھی ان ضرورتوں کو سمجھتا رہا اور زمانے کے

تقاضے کے مطابق نفس مضمون اور اپنے طریقۂ تعلیم میں تبدیلیاں کرتا رہا۔ ان تبدیلیوں اور تغیّرات کی کہانی بہت لمبی ہے اور جتنی طولانی ہے، اتنی ہی دلکش بھی ہے۔ ہمارا مقصد اس کہانی کا یاد دلانا یا دہرانا نہیں۔ ہمارا مدعا تو صرف اس قدر ہے کہ اس مسلسل ترقی اور اس پیہم کوشش میں کامیابی کا سہرا معلم کے سر بندھا ہوا دیکھیں اور اس بات کا اعلان کر دیں کہ اُس نے دنیا کو کیا سے کیا بنا دیا ہے اور ابھی کیا کچھ بنا دینا اس کے ذمے باقی ہے۔

صدیوں سے تعلیم ایک سماجی کام ہے۔ اس میں معلم، متعلم، متعلم کے والدین اور مدرسہ براہِ راست مشغول ہیں۔ معلم کا فرض رہا ہے کہ ضروری تعلیم دے۔ متعلم کا کام ہے کہ علم و تربیت حاصل کرے۔ والدین کا کام ہے کہ وہ ہر طرح معلم کے معاون اور مددگار رہیں، کیونکہ تقسیم کار کے اصول پر معلم بھی تو ان کے فرائضِ پدری و مادری کی ایک گونہ ذمہ داری لینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ مدرسہ وہ جگہ ہے، جہاں سے یہ تینوں عنصر الگ اور یکجا ہو کر ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس سے ان کے مقاصد کی تکمیل ممکن ہے۔ یہ چاروں عناصر ہی اتحادِ عمل سے معلم کو کامیاب بنا سکتے ہیں اور کامیاب تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ فرد اور سماج اس درجہ ایک دوسرے سے مربوط ہو جائیں کہ افراد کی فلاح سماج کی فلاح ہو اور سماج کی بہبود افراد

کی بہبود ۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہے، جب عنصرِ اعظم، یعنی، معلم اپنے فرائض کو سمجھ لے اور پھر ہمیشہ اور ہر حالت میں ان فرائض کی ادائیگی ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالے ۔ اس کی تھوڑی سی معاش، اس کے تکلیف دہ اسبابِ زندگی، ناشناس کی تحسین اور سخن شناس کا سکوت، اس کے ارادوں کو متزلزل کردینے کے لیے کافی ہیں، لیکن یہ سلوک اس کے ساتھ اکثر رہا ہے اور وہ اس سلوک کے باوجود اپنے فرض سے غافل نہیں رہا ۔

بالعموم معلم کو سماج میں وہ اقتدار حاصل نہیں، جو ہونا چاہیے ۔ اس کی مختلف وجوہ ہیں ۔ ہم بیشتر ان اشیا اور افراد سے ڈرتے ہیں، جو ہمیں نقصان پہنچا سکتے ہیں اور معلم بقول حضرت شیخ سعدیؒ ؎

من آں مورم کہ در پایم بمالند   نہ زنبورم کہ از نیشم بنالند
چگونہ شکرِ ایں نعمت گزارم   کہ زورِ مردم آزاری ندارم

بے آزار اور فائدہ رساں زمرے میں سے ہے، اس لیے اس کا اقتدار اس قسم کا نہیں، جیسا کہ عُمّالِ حکومت کا ہے اور یہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے ۔ بہرحال یہاں اس بات کی گنجائش نہیں کہ ہم تفصیل کے ساتھ معلم کی بد اقتداری پر کچھ لکھیں ۔ ہم تو صرف اس قدر بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس بد اقتداری کا ذمے دار بالکلیہ سماج ہی کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا ۔ اس کا ذمے دار بہت بڑی حد تک معلم خود بھی ہے ۔

وہ اپنا فرض صرف درس و تدریس ہی کو سمجھتا ہے۔ مدرسے کا وقت ختم ہونے
کے بعد اس کا تعلق طلبہ سے بالکل منقطع ہو جاتا ہے اور اس لیے عام لوگ بھی
درس و تدریس کو ایک ایسی چیز سمجھتے ہیں، جو ہر جنس کی طرح بازار سے خریدی
جا سکتی ہے۔ معلم نے تعلیم کو اتنا محدود کر دیا ہے کہ اس کا مدعا صرف تدریس رہ
گیا ہے۔ تدریس میں کامیابی کا معیار صرف یہ ہے کہ فلاں مدرسے میں کتنے طلبہ
تعلیم پاتے ہیں۔ امتحانات کے نتائج کیا فیصدی ہیں۔ کتنے لڑکے امتحانات میں
وظائف حاصل کر سکتے ہیں، لیکن یہ معیار قطعی قرار نہیں دیے جا سکتے۔ ہمیں اس
سے انکار نہیں کہ یہ باتیں مدرسے کی کامیابی کے اسباب میں شریک ہیں، لیکن
سب سے زیادہ ضروری بات تو یہ ہے کہ ایک مدرسے کے طلبہ سماج کی ضروریات
سے کس درجہ ہم آہنگ ہیں۔ کیا جغرافیہ، تاریخ اور ریاضی میں ان کا علم ان کی
زندگی کو خوشگوار اور کامیاب بنانے میں مفید ثابت ہو رہا ہے؟ ان کی مفید اور
کامیاب زندگی سماج کے موافق ہے یا متناقض؟

ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے مدرّس اپنے دل میں سوچیں گے اور غور و فکر
کے بعد یہ معلوم کرنے کی کوشش کرینگے کہ ان کا مدرسہ اور ان کا کام کس حد تک
سماج کی بہبود کا ذمے دار ہے۔ مردم شماری اور تعلیم کی رپورٹوں میں روز یہ بات
نظر سے گزرتی ہے کہ دیہاتی تھوڑی سی تعلیم پا کر دیہات کی زندگی کے مقابلے میں

شہر کی زندگی کو ترجیح دیتا ہے اور اُسے اپنے آبائی پیشے، اپنے ڈھور ڈنگر اور اپنی زمین سے وہ محبت نہیں رہتی، جو اُس کے غیر تعلیم یافتہ بھائی کو ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ اپنوں سے بیگانہ کر دے۔ تعلیم کا مقصد تو یہ ہے کہ اپنے بچھڑے ہُوے عزیزوں کو بھی ملا دے۔ یہ سب اسی وقت تک ممکن ہے کہ ہمارے دیہاتی مدرس گاؤں کی سماج سے خود بیگانے نہ ہوں۔ چوپال میں ان کے دم سے وہ روشنی ہو، جو بیچارے دیہاتی کی تاریک زندگی کو کچھ تو روشن بنا سکے اور مناسب ترین بات تو یہ ہے کہ ہر دیہاتی مدرسہ ہی چوپال بن جائے۔ مدرّس مشغلۂ تعلیم کے دوسرے تین عناصر، یعنی متعلم، اس کے والدین اور مدرسے کو ہر دم پیشِ نظر رکھتے ہوے، اپنی زندگی کا جُز بنا لے اور اپنی زندگی کو سماج کی زندگی کا ایک جُز بنا دے۔

معلّم اور متعلّم کے تعلقات

ہمارے مدرسین کی زندگی اکثر بے حد ہی کم رنگ اور بے کیف ہوتی ہے۔ بالعموم ایک مدرس صبح اُٹھتا ہے اور معمولات کی تکمیل کے بعد مدرسے پہنچ جاتا ہے۔ اب دس بجے سے چار بجے تک وہ مدرسے میں ہے۔ آج اتنے گھنٹے پڑھانا ہے۔ یہ مضامین پڑھانے ہیں۔ روزمرہ کی کارروائی، یعنی، کاپیاں دیکھنا اور دفتر سے متعلق فرائض انجام دینے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ چار بجے تک ہے۔ چار بجے چھٹی کی گھنٹی بجی اور مزدور نے اپنا کام ختم کیا۔ گھر کی راہ لی۔ کم و بیش ہر مدرس دن کے کام کو صرف دِن بھر کی محنت سمجھ کر انجام دیتا ہے۔ جب صورتِ حالات یہ ہو، تو کیا تعجّب کا مقام ہے کہ طلبہ بھی چھٹی کی گھنٹی کو پیغامِ مسرت سمجھتے ہیں اور مدرسے سے آزاد ہونے پر وہی خوشی مناتے ہیں، جو زندانی زنداں سے رہا ہو کر۔ اس سے مدعا یہ نہیں کہ ہمارے

مدرسین فرض شناس نہیں یا وہ کام سے جی چراتے ہیں۔ نہیں، ہمارے مدرسین تو حقیقتاً مجاہد ہیں۔ قلیل مشاہرہ پر قانع ہیں۔ انتہا درجے کے فرض شناس ہیں محنت اور کام میں اپنے آپ کو کھو دیتے ہیں۔ پھر آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ وہ مقاصد تعلیم کی تکمیل میں اس درجہ کامیاب نہیں، جتنا اُنھیں ہونا چاہیے۔

اس موضوع پر دو زاویہ نگاہ سے غور کیا جا سکتا ہے۔ اوّل، مدرس اور طلبہ کے تدریسی تعلقات۔ دُوم، مدرس اور طلبہ کے غیر تدریسی تعلقات۔

ایک مدرس جب جماعت میں جاتا ہے، تو وہ اکثر و بیشتر اس امر سے آگاہ ہوتا ہے کہ اس کے سبق کا کچھ حصّہ جماعت کے چند طلبہ کے لیے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ ہر جماعت میں کچھ لڑکے بہت ہوشیار ہوتے ہیں اور کچھ بہت کمزور۔ اُستاد کا واسطہ بیشتر نہ بہت کمزور سے ہوتا ہے، نہ بہت ہوشیار سے۔ وہ تو اپنی تمام تدریس کو متوسط درجے کے طلبہ پر منحصر کر دیتا ہے۔ ہوشیار لڑکے کبھی کبھی اپنے زعمِ علم کے اعلان کے لیے بول پڑتے ہیں یا مشکل سوالات کا جواب لینے کے لیے مدرس ان سے مخاطب ہوتا ہے۔ کمزور لڑکے بیچارے خائف بیٹھے رہتے ہیں تاکہ مدرس کی نگاہ کی زو سے بچے رہیں۔ ان کا اور اُستاد کا تعلق اکثر و بیشتر فہمائش اور زدوکوب کا ہوتا ہے ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ کم و بیش پندرہ سولہ لڑکے مدرس کے علم اور کام سے متمتع نہیں ہوتے۔

اس کا علاج کیا ہے؟ انفرادی تدریس اب ممکن نہیں۔ سو پچاس سال پہلے

تو البتہ اُستاد سبق فرداً فرداً سنتا تھا اور پڑھاتا تھا، لیکن اس دَور میں تو ہر کام مشین کے اصول پر ہوتا ہے اور جب یہی اصول مدارس میں بھی رائج ہو، تو ظاہر ہے کہ اس مشکل کا کوئی تسلی بخش انتظام نہیں ہو سکتا۔ البتہ مندرجۂ ذیل لائحۂ عمل ایک بہت بڑی حد تک اس غیر اختیاری گناہ کا کفارہ ہو سکتا ہے۔

مدرّس کا فرض ہے کہ وہ طلبہ سے شخصی علاقہ اور واسطہ پیدا کرے۔ طالب علم کے گھر کے متعلق اطلاعات بہم پہنچائے۔ اس کے سرپرست سے راہ و رسم پیدا کرے۔ اس کے طور وطریق، مزاج، چال چلن اور دماغی صلاحیتوں سے آگاہ ہو جائے۔ یہ کام مشکل ہے، لیکن اس کا بڑا انعام ہے۔ مدرّس کو طلبہ پر ایک جذباتی اقتدار حاصل ہو جاتا ہے اور اس کے ماتحت ہر طالب علم بلاتکلف اپنی دقّتوں اور مشکلات کو اپنے اُستاد کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ جماعت میں سبق دیتے ہوئے، اُستاد کو معلوم ہو جائے کہ فلاں طالب علم کی مشکلات اس قسم کی ہوتی ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ چند کمزور طلبہ کی مشکلات ایک ساتھ ہی حل ہو جائیں۔ مدرّس کا مقصد صرف اسباق کی تدریس نہیں۔ وہ صرف کتاب پڑھانے پر مامور نہیں۔ مدرّس تو طلبہ کی تدریس کرتا ہے۔ اس کا واسطہ افراد سے ہے، نہ کہ صرف اسباق سے اور ہر چند کہ وہ چالیس لڑکوں کی جماعت میں فرداً فرداً ہر ایک طالب علم کو توجہ نہیں دے سکتا، لیکن اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کس طالب علم کو کیا درکار ہے۔

مُعلّم کا نصب العین

چند روز کی بات ہے کہ اخباروں میں ایک نہایت ہی المناک واقعے کے متعلق اظہار خیال کیا گیا تھا اور حقیقت میں ایسے واقعات کچھ اس نوع کے ہیں کہ اگر ایک صدی میں ایک مرتبہ بھی ایسا ہو جائے، تو پوری ایک صدی اس پہ رویا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک فرض شناس مدرس نے ایک طالب علم کی بے پروائی سے تنگ آکر اُسے سبق یاد کرنے کی تلقین کی اور اس تلقین کو موثر بنانے کے لیے اس بچے کو دھوپ میں کھڑا کر دیا۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ، اُستاد کا خوف، سزا کی تکلیف بتدریج بچے کے جسم اور مزاج پر اثر کرتی گئی۔ ایک، ڈیڑھ گھنٹے دھوپ میں کھڑے رہنے کے باعث بچہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور اس بیہوشی سے پھر نجات نہ پائی، چند گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد مر گیا۔ اس سے چند سال قبل بھی ایک

حادثہ اس نوع کا ہو گیا تھا۔ اجمالاً وہ واقعہ یہ ہے۔ ایک غبی طالب علم کو تادیب کے لیے اُستاد نے ایک کوٹھڑی میں، جس میں مدرسے کا ٹوٹا پھوٹا اسباب پڑا تھا، بند کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکے نے چیخنا چلّانا شروع کیا۔ ماسٹر صاحب، سانپ! ماسٹر صاحب، سانپ! کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم جماعت لڑکے بعض ہنسے، بعض خائف ہُوئے۔ ماسٹر صاحب نے نہایت بے پروائی سے طالب علم کی چالاکی پر محمول کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد رونے دھونے کی آوازیں بند ہو گئیں۔ اُدھر گھنٹہ بھی ختم ہو گیا۔ ماسٹر صاحب نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا۔ لڑکا بیہوش پڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کے لیے دوڑ بھاگ شروع ہوئی، لیکن کوبرا سانپ کا زہر اثر کر چکا تھا۔ شام سے پہلے پہلے سبق یاد کرنے کی تکلیف اور مدرس کے خوف سے وہ لڑکا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گیا۔

ایسے واقعات اگرچہ لاکھوں میں ایک ہوتے ہیں، لیکن مدرّسین کے لیے یہ ایک اہم مسئلہ پیش کرتے ہیں، یعنی، ایک اُستاد کو کس حد تک اپنے طلبہ کو جسمانی سزا دینے کا حق ہے اور محدود حق کو مدِّ نظر رکھتے ہُوئے یہ کہاں تک جائز ہے کہ کسی بچے کو کسی جرم کی جسمانی سزا دی جائے۔

میرا مقصد سررشتۂ تعلیم کے احکام کا اعادہ کرنا نہیں۔ مَیں تو صرف ایک مدرس کی حیثیت سے اپنے ہم پیشہ بھائیوں سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہتا ہوں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر جماعت میں چند طلبہ قدرتاً غبی ہوتے ہیں اور چند نکمے

اور بیکار، جنھیں محنت، غور و خوض اور کام کرنے کی عادت ہی نہیں ہوتی۔ مدرّس کے سامنے چالیس کے قریب طلبہ ہوتے ہیں۔ وہ چند کی خاطر زیادہ کی تدریس میں نقص انداز نہیں ہونا چاہتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غبی روز بروز غبی تر ہوتے جاتے ہیں اور کام چور روز بروز زیادہ سست اور کاہل۔ اصول تدریس یہ چاہتے ہیں کہ مدرّس تدریس کے دوران میں ان طلبہ پر بھی نظر رکھے اور انھیں اُن کی بساط اور مزاج کے مطابق معلومات دے کر اُوپر اُبھارے۔ مدرّس کا یہ کام نہیں کہ زجر و توبیخ اور زدوکوب کرے اور بس ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے مزا تو جب ہے کہ گرتے کو تھام لے ساقی

میرے اس بیان کو پڑھ کر اکثر احباب یہ سمجھیں گے کہ حضرت نے کبھی مدرسے میں پڑھایا نہیں ہے، اسی لیے یہ میٹھی میٹھی باتیں کر رہے ہیں۔ کبھی مدرسے میں پڑھائیں، غبی لڑکے سے واسطہ پڑے، تو پھر ہم دیکھیں کہ یہ بلند آہنگ اصول کب تک قائم رہتے ہیں، لیکن مَیں مدرسے کی تدریس کا شرف بھی رکھتا ہوں اور میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ کوئی لڑکا بھی ایسا نہیں ہوتا، جسے مار پیٹ کے بغیر راہ پر نہ لگایا جا سکے۔ البتہ یہ شرط ہے کہ اُستاد اس بات کا عہد کر لے کہ مَیں اپنی انتہائی کوشش کمزور اور کام چور طلبہ کی اصلاح پر صرف کر دوں گا۔

ایک بار دو قیدی قید خانے کے دروازے پر کھڑے باہر دیکھ رہے تھے۔

رات ہو چکی تھی ۔ نہایت زور کی بارش کے بعد مطلع صاف ہو گیا۔ چاند اور تاروں کی روشنی میں قید خانے کے باہر کی کیچڑ سے بھری ہوئی سڑک نظر آ رہی تھی ۔ ایک پہرے دار گھومتا پھرتا دروازے کے پاس آ پہنچا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے، قیدیوں سے پوچھنے لگا: "کیا دیکھ رہے ہو"۔ ایک قیدی بولا: "دیکھو چاروں طرف کیچڑ ہی کیچڑ نظر آتی ہے"۔ دوسرے نے کہا: "ستارے کیسے چمک رہے ہیں! کیا ٹھنڈے اور بھلے معلوم ہوتے ہیں"۔

تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ مدرسی ایک قید ہے ۔ بیحد ناگوار۔ مدرّسوں کے اختیارات محدود ہیں، یعنی، وہ اقتصادی، سماجی اور تدریسی قید خانے میں ہیں، لیکن یہ کیا فرض ہے کہ ہمیں پہلے قیدی کی طرح سڑک کی کیچڑ ہی نظر آئے اور آسمان کے تارے نظر نہ آئیں ۔ میں فخریہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے ہم پیشہ بھائی آسمان کے تارے دیکھنے کے عادی ہیں ۔ شاید ہی کوئی سڑک کی کیچڑ دیکھتا ہو، لیکن میں یہ سوچ کر بھی سر جھکا لیتا ہوں کہ ایک لاکھ میں سے ایک سہی، لیکن ہم میں سے ایک آدھ کیچڑ دیکھنے کا عادی بھی ہے

ہمارے مشاہرے قلیل سہی، ہماری حیثیت سماج کی نگاہ میں بلند نہ سہی، لیکن ہمارا پیشہ ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم میں سے ایک فرد واحد بھی سڑک کی ذلیل کیچڑ پر نظر ڈالے اور تارے نہ دیکھے ۔ ایسی ظالمانہ

سزائیں، جو مہلک ثابت ہوں یا کیسی ہی جسمانی سزا سہی، ہمارے نزدیک ذلیل کیچڑ دیکھنا اور دلدل اُچھالنا ہے۔ زندگی کی کش مکش روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ والدین اور اُستاد ابتدا سے اسی فکر میں لگے رہتے ہیں کہ اپنے بچوں کو زندگی کی لڑائی لڑنے اور میدانِ حیات میں فاتح بننے کے لیے تیار کریں۔ مجھے اس خواہش اور کوشش کے خلاف احتجاج کرنے کی نہ خواہش ہے، نہ ضرورت، میں تو صرف یہ بات یاد دلانا چاہتا ہوں کہ خود "زندگی" بھی ایک حسین چیز ہے۔ ہمیں چاہیے کہ محارباتِ حیات میں "لذّتِ حیات و رحُسنِ حیات" کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں اور اگر یہ ہماری نگاہ سے اوجھل نہیں ہوئیں، تو یقین مانیے کہ ہمارے فرائض منصبی بھی ہمیں حسین اور دلکش ہی نظر آئیں گے اور ہمارے غبی لڑکے بھی ہمارے لیے اتنے ہی محبوب بن جائیں گے، جتنے ذہین طلبہ اور کیا کوئی اپنی محبوب ہستیوں کو اذیت پہنچایا کرتا ہے؟ کیا کوئی اپنی محبوب ہستیوں کی ہلاکت کا باعث بھی ہو سکتا ہے؟ اگر یہ ہو سکتا ہے، تو ظاہر ہے کہ محبت کے اسالیب جلد از جلد بدل دینے چاہییں ؎

محبت آپ کو بیشک، ولے قرباں محبت کے
کہ لے کر ذبح کر ڈالا بہت جب پیار میں آئے

مُعلّم اور سزائے جسمانی

انگریزی زبان میں ایک مثل مشہور ہے: "قمچی کا دھیان اور لڑکے کا زیاں"۔ یورپ کے مدرسین اس کلّیے پر عمل پیرا رہے اور ہندوستان میں آج بھی بیشتر مدرسین اس کہاوت کو تعلیم و تدریس کا ایک زرّیں اصول سمجھتے ہیں۔ البتہ، نئی روشنی کے مدرسین اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور یوں تدریسی اکھاڑے میں دو حریف نظر پڑتے ہیں: ایک جسمانی سزا کا قائل و حامی۔ دوسرا اس سے برگشتہ اور شاکی۔ فریقین دلائل پیش کرتے ہیں، تو پہلا یوں گویا ہوتا ہے: "جناب بچے اور شیطان میں ایک جُز مشترک ہے اور لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ آپ ذرا ایک جماعت کو پڑھائیں، دو چار روز میں خود حقیقت آشکار ہو جائیگی۔ آپ مغز کھپا رہے ہیں اور بھورام سو رہا ہے۔ آپ حساب کا نیا قاعدہ

سمجھا رہے ہیں اور عزیز حسن پرکار چبھو چبھو کر اپنے پاس بیٹھنے والے کو عاجز کیے دیتا ہے۔ آپ بار بار کہتے ہیں۔ لڑکو سنو، یہ قاعدہ ضروری ہے اور یہ بات دلچسپ ہے۔ وہ ذرا سی جھرجھری لیتے ہیں اور سیدھے ہو بیٹھتے ہیں، لیکن دم بھر میں پھر اس مستعدی کا اعلان تجدید شرارت سے ہوتا ہے، لیکن ایک دو چپت لگا دیجیے، ایک آدھ بید جھاڑ دیجیے، بس پھر سب متوجہ نظر آئیں گے"۔ فریقِ مخالف اس دعوے کے بُطلان میں سر ہلاتا ہے اور کہتا ہے: "جی بجا ارشاد ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ اب متوجہ ہو گئے، مطلق نہیں۔ صرف جَو فروشی اور گندم نمائی شروع ہو گئی۔ ظاہرا ہمہ تن توجہ اور اصل میں ان بچوں کے دل اور دماغ بھوت کی طرح بھٹکتے پھرتے ہیں۔ بدرجۂ مجبوری اپنے اُوپر جبر کیے بیٹھے رہتے ہیں گھنٹی بجی اور اس انقباضِ دماغی کا آپ کو ثبوت ملا۔ لڑکے اٹھ اٹھ کر ایسے بھاگے جیسے قیدی رہا ہوا ہو"۔

فریق اوّل کہتا ہے: "جناب ماسٹر صاحب ہم بھی ٹریننگ کالج میں پڑھ چکے ہیں۔ درسیات میں ہم نے بھی بہت کچھ پڑھا ہے۔ جب کالج سے نئے نئے نکلے تھے، تو ہمارے دل میں بھی یہی خیالات تھے، مگر اب مدرسی کرتے کچھ سال گزر گئے ہیں۔ اب ہم ٹریننگ کالج میں حاصل کردہ اصولِ تعلیم کو شک اور شبہے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہم ہی کیا سارے پُرانے پُرانے ہم پیشہ دوست بھی

ہم سے متفق الخیال ہیں اور کہتے ہیں کہ واقعی لڑکے قیمچی کے ہیں۔ سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلتا۔ سزا ضروری ہے، لیکن (پاسِ وضع کے باعث کہتے ہیں) ہم یہ مانتے ہیں کہ قصائی پن اور سزا و تادیب میں فرق ہے۔"

چونکہ دونوں فریقوں کا عقیدہ ہی یہ ہوتا ہے اور تصنّع سے نہیں، خلوص دل سے یہ دلائل پیش کرتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ دونوں جماعتوں کے دعووں کا تجزیہ کیا جائے، تاکہ اصلیت کھلے۔

ہر جماعت میں تین طرح کے لڑکے ہوتے ہیں۔ اوّل: وہ، جو ہوشیار اور محنتی ہوتے ہیں، کام میں جی لگاتے ہیں اور ذہنِ رسا بھی ان کا معاوِن ہوتا ہے۔ یہ ہر جماعت میں پہلے، دوسرے یا ایسے ہی ممتاز درجے پر رکھے جاتے ہیں۔

دوسرے: وہ، جو حتی المقدور کام کاج بھی کرتے ہیں، سوچ بچار بھی۔ کاغذ کتاب سے تھوڑا بہت دل لگائے رکھتے ہیں اور بھلے بُرے پاس بھی ہو جاتے ہیں، یعنی، یہ جماعت کا متوسّط طبقہ ہیں۔ استاد کو ان سے نہ کوئی شکایت، نہ کچھ فریفتگی۔

تیسرے: وہ، جو جماعت میں ایسی ہی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، جیسے سماج کے باغی۔ کتاب اُنھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی، لکھنے پڑھنے سے دل

گھبراتا ہے۔ معمولی نوشت و خواند بھی اُنھیں عذاب معلوم ہوتی ہے۔ مجبوراً بیگار پوری کرتے ہیں، لیکن ان کے دماغ مدرّس کے "لُقمہائے علم" سے الٹتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں کچھ آتا جاتا نہیں اور وہ اس کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ کچھ سمجھ لیں۔

پہلا اکثر سزا سے مامون رہتا ہے، دوسرا کبھی کبھی مدرّس کے غصے کی جھپٹ میں آجاتا ہے اور تیسرا طبقہ تو ہر وقت دار و گیر ہی میں پھنسا رہتا ہے۔ بیکاری کا شغل شیطان سے یاری ہے۔ جب جماعت میں بیکار ہی بیٹھتے ہیں، تو شیطان سے یاری لامحالہ ہو جاتی ہے۔ جماعت کے "رحمٰن"، یعنی، مدرس اور ان طلبہ کے شیطان، یعنی، بدشوقی میں علیؓ۔ کافر کا بَیر ہے، اس لیے سزا اور تادیب کے لیے مدرّس کا تختۂ مشق ہی آخر الذکر جماعت ہوتی ہے۔ مدرّس کے لیے ہر طالب علم کی فرداً فرداً تدریس تو ممکن ہی نہیں، جماعت کو پڑھاتے ہوئے متوسّط طبقہ ہی توجہ کا مرکز ہوتا ہے۔ ہوشیار لڑکے تدریس میں صرف اس قدر ہی دلچسپی لیتے ہیں، جتنی آموختے میں، مگر غبی، کمزور، پچھڑے ہوئے لڑکے اس میں قطعاً دلچسپی نہیں لیتے۔ تجربہ کار اور موقع شناس مدرّس ہر چند کہ متوسط طبقے پر اپنی توجہ جمائے رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی ہوشیار لڑکوں کو بھی گُدگُدا دیتا ہے اور اکثر نکات ان کی دلچسپی کے بھی پیش کرتا ہے۔ مگر کمزور اور غبی لڑکوں سے بالعموم بہت کم دماغی تعلق رکھتا ہے۔ مدرّس کو کیا کرنا چاہیے؟ اس قدر گہرا اور پیچیدہ مسئلہ ہے کہ

اس پر شرح و بسط سے کچھ کہنے کا موقع نہیں۔ یہاں صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ اچھے مدارس میں، جہاں سالانہ ترقی کے وقت سفارش کارگر نہیں ہوتی، یہ دقت خود بخود بہت حد تک رفع ہو جاتی ہے اور متعدد طریقے ایسے ہیں، جن کی بدولت اس تفاوتِ دماغی کو کم کیا جا سکتا ہے اور جس قدر یہ کم ہوتا جاتا ہے، اسی قدر سزا اور زدوکوب کی ضرورت بھی کم ہوتی جاتی ہے، لیکن ؏

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

اس لیے کچھ نہ کچھ سزا کی "ضرورت" باقی رہ جاتی ہے اور عام مدرّس اسی ضرورت کے ماتحت مار پیٹ سے باز نہیں آتے۔

اس سزا اور تادیب کا مقصد کیا ہے؟

اولاً تو یوں سمجھیے کہ آپ نے آگ میں ہاتھ ڈالا اور ہاتھ جل گیا۔ آپ نے ربڑ کی گیند زمین پر ماری اور وہ اچھل گئی، یعنی، ہر عمل کے بعد ردِ عمل ہُوا۔ لڑکے نے کوئی حرکت آدابِ تدریس و تعلیم کے خلاف کی اور آپ نے اُسے سزا دے دی۔ یہ نقطۂ خیال مدرّسین کے شایانِ شان نہیں۔ اس میں جذبۂ انتقام کارفرما نظر آتا ہے اور مدرّس منتقم نہیں۔ وہ تو مصلح اور دوست ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ مدرسین اس اصول کے ماتحت طلبہ کو ہرگز سزا نہیں دے سکتے۔

ثانیاً سزا کا مقصد تادیب ہو سکتا ہے، یعنی ایک لڑکے نے کوئی ناشائستہ حرکت

کی۔ آپ چاہتے ہیں کہ وہ ناشائستہ حرکت آپ کی موجودگی میں دوبارہ نہ ہو۔ آپ نے لڑکے کو سزا دے دی اور قصّہ ختم کیا۔ مثال میں انگلستان کے مشہور جج کا ایک فیصلہ پیش کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ اس جج کی عدالت میں ایک ایسا شخص پیش ہُوا، جس نے مختلف لوگوں کی بھیڑیں چرائی تھیں۔ جج نے اُسے قید کی سزا دی اور کہا کہ تمھیں اس لیے سزا نہیں دی جا رہی ہے کہ تم نے بھیڑیں چُرائی ہیں، بلکہ اس لیے کہ بھیڑیں نہ چرائی جائیں۔ اس فیصلے سے یہ ظاہر ہے کہ بھیڑ کی حفاظت مقصود تھی، نہ کہ مجرم کی اصلاح۔ اب ظاہر ہے کہ سزا کا یہ اصول بھی مدرسین کے لیے قابلِ اعتنا نہیں ہو سکتا۔

آپ لڑکے کی توجہ مار پیٹ سے حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے اصول و قواعد اور ہیں اور اُن کی رُو سے سزا کی اجازت نہیں۔ سزا تو صرف "اخلاقی" اصلاح کے لیے ہی جائز قرار دی جا سکتی ہے اور وہ بھی اس صورت میں جب اور ذرایع سے کامیابی ممکن نہ ہو۔ اس تمام بحث سے سزا پر ایک معمولی سی روشنی پڑ گئی ہے اور اب یہ ممکن ہے کہ اس اجمال سے ہر مدرس اپنے علم اور تجربے کی بنا پر ایک مفصل بحث مرتب کر لے، جو سزا کے اہم مسئلے پر اس کی ہدایت کر سکے اور خود ہی یہ فیصلہ بھی کر لے کہ سزا کب، کس طرح اور کیونکر دی جائے اور اس تدریس و تعلیم کے سلسلے میں یہ ناگوار فرض کس طرح کرختگی کی آلودگی سے پاک کیا جا سکتا ہے۔

طلبہ کا اعتماد حاصل کرو

نیا اُستاد جب پہلے پہل کسی نئی جماعت میں آتا ہے، تو یہ منظر بہت عجیب ہوتا ہے۔ اُستاد اگر ناتجربہ کار اور مبتدی ہو، تو منظر اور بھی زیادہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔ اُستاد اور طالب علم اپنی اپنی جگہ عجیب سی کشمکش محسوس کرتے ہیں۔ اُستاد طالب علموں کے متعلق سوچتا ہے اور طالب علم اُستاد کی ہیئت و حرکت پر غور کرتے ہیں۔ غرض کہ دونوں کی دماغی کیفیت عجیب سی ہوتی ہے۔ اُستاد غریب کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کہیں پہلے ہی دن اپنا وقار نہ کھو بیٹھوں۔ اس لیے وہ ضبط گویا وقار کو قائم رکھنے کے لیے بڑی ہوشیاری سے کام لیتا ہے۔ دو ایک شوخ اور چنچل بچے جو شاید اس کی اجنبیت پر منہ چڑاتے ہیں، انھیں بمصداق "گربہ کشتن روزِ اوّل" قرار واقعی سزا دیتا ہے۔ دوسری طرف بچوں کو بھی یہ خیال ہوتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو، یہ

نو وارد آتے ہی ساری جماعت پر چھا جائے اور ہماری آزادی کو سلب کرلے۔ اِس خطرے کو روکنے کے لیے وہ عجیب عجیب اقدام کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جونہی اُستاد کی توجہ کسی دوسری طرف ہوئی، یہ ڈیسک پر تھاپ دینے لگے۔ بعض ایسے موقعوں پر منہ چڑانے لگتے ہیں۔ بعض اُٹھتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر اُٹھتے ہیں اور پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کے ننھے دماغ اس بات کے سمجھنے سے عاری ہیں کہ اُستاد ان کی طفلانہ حرکتوں سے ہراساں یا مرعوب نہیں ہوگا۔ لیکن یہ غیر معمولی فضا دیر تک قائم نہیں رہتی۔ کچھ دنوں بعد اُستاد بچوں کو اور بچے اُستاد کو سمجھ لیتے ہیں اور اکثر حالتوں میں ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جماعت میں زیادہ تعداد ان بچوں کی ہوتی ہے، جن کا رجحان پڑھنے کی طرف نہیں ہوتا۔ ان میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں، جو اُستاد کی آواز کو قوتِ سامعہ پر بار سمجھتے ہیں اور ان کی دانست میں وقت کا بہترین مصرف یہ ہوتا ہے کہ اُسے سو کر گزار دیا جائے یا ہنسکر یا دوسرے ہم جماعتوں کو ستا کر۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں، جو جسمانی طور پر تو جماعت میں حاضر ہوتے ہیں اور بظاہر درس کو بغور سنتے بھی ہیں۔ اُستاد کی ہر حرکت کا جائزہ بھی لیتے ہیں۔ اس کے چہرے کو بڑے انہماک سے تکتے بھی ہیں، لیکن ذہنی طور پر اُنھیں جماعت کی فضا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ہوائی قلعے میں بند ہوتے ہیں اور اُستاد کے لفظوں کی گولہ باری سے قطعاً محفوظ۔ ایسے بچّے اُستاد کی کسی کاوش کو بھی قابلِ التفات

نہیں سمجھتے۔ ان حالات میں دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہو جاتی ہے اور جب تک یہ خلیج پاٹ نہ دی جائے، اُستاد اور بچوں میں کبھی ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کی ذمّے داری ہمارے اُستاد پر ہے۔

اُستاد کو اپنے طرزِ عمل سے ثابت کرنا چاہیے کہ وہ ایک ہمدرد دوست اور مشکلات کو دُور کرنے والا ساتھی ہے اور مدرسے کی زندگی طلبہ اور اُستاد کے مابین مہر و محبت کی زندگی ہے اور شرکتِ عمل کی زندگی ہے۔ اگر اُستاد اس نوع کے مراسم پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے، تو اپنی تدریس میں پورے طور سے کامیاب ہو جائے گا، ورنہ نہیں۔

جماعت کی فضا کا تعلیم و تدریس پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ اچھی فضا سلسلۂ تدریس پر خوشگوار اثر پیدا کرتی ہے اور بُری فضا ناگوار۔ جو جماعت خوف و ہراس کی فضا میں کام کرتی ہے، اتنا اچھا کام نہیں کر سکتی، جتنا اچھا وہ جماعت، جو مہر و محبّت کی فضا میں کام کرتی ہے۔ سب سے پہلا کام اُستاد کا یہی ہے کہ خوف و ہراس کے ہوّے کو دُور کر دے۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ پرائمری تک کے طلبہ ایسے ہی خوف کے ماحول میں تعلیم پاتے ہیں۔ نیا اسکول، نیا مضمون، نیا اُستاد اس خوف میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے اور سلسلۂ تدریس کی بنیاد خام رہتی ہے۔ یہ حقیقت مسلّم ہے کہ بنیاد درست نہ ہو، تو عمارت بھی استوار نہیں ہوتی۔ طلبہ کا خوف جاری رہے، تو ترقی کی رفتار بہت کم ہوتی ہے۔ لڑکے آواز نکالتے ہُوئے

ڈرتے ہیں۔ فقرے بناتے ہُوے ڈرتے ہیں۔ یہ ڈر ان کی ساری حیات وحرکت پر چھایا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُنھیں اپنی ذات پر اعتماد نہیں رہتا۔ غلطیوں کے احساس سے خوف ہوتا ہے۔ اُستاد کا پہلا فرض ہے کہ اس قسم کے خوف کو ان کے دلوں سے نکال دے اور اُنھیں یقین دلادے کہ غلطیاں کرنا ان کے لیے شرم وننگ کا باعث نہیں، خوف وہراس کا موجب نہیں، بلکہ غلطیوں کی درستی ہی اُنھیں راہِ راست پر لاسکتی ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی طالب علم سے کام لینا مقصود ہو، تو ہم اس کی عادت کے خلاف کوئی بات کہہ کر اس کی کام کرنے کی قوت کو اُبھارنا چاہتے ہیں۔ مثالاً: اگر ہم چاہیں کہ کسی لڑکے سے زیادہ مستعدی سے کام لیں، تو ہم اُسے کہہ دیتے ہیں، "تم بہت کاہل ہو"۔ وہ طالب علم اپنی وضعداری کو قائم رکھنے کے لیے جلد از جلد کام ختم کر لیگا، لیکن اس کے ذہن میں کاہلی کا احساس غیر محسوس طور پر داخل ہو جائیگا اور رفتہ رفتہ قوت پکڑ لیگا۔

آپ کسی طالب علم کو 'سُست' کہتے رہیں، تو یقیناً وہ سُست ہو کے رہے گا۔ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے اور اگر آپ طلبہ سے کہیں کہ اِس قدر کام تمھیں اتنے عرصے میں کرنا ہوگا، ساتھ ہی آپ یہ بھی کہہ دیں، یہ کام تمھارے لیے بہت آسان ہے اور تم اُسے بہت جلد ختم کر سکتے ہو، تو بیشتر طلبہ دلجمعی کے ساتھ

کام کرتے رہیں گے اور اس طرح ان کے حوصلے بھی بڑھیں گے۔

اُستاد کو لڑکوں کے ساتھ اس قسم کا رویہ اختیار کرنا چاہیے کہ طلبہ اُستاد پر پورا پورا اعتماد رکھیں۔ ایسا نہیں کہ انھیں بات بات پر مرعوب کرے۔ جگہ جگہ انھیں نا اُمید کرے۔ یہی اعتماد ایک ذریعہ ہے، جس سے طلبہ اور اُستاد کے درمیان کی خلیج پاٹ دی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی اُستاد صحیح طور پر طلبہ کی دستگیری کرنا چاہے، تو ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک شفیق اور ہمدرد کی صورت میں پیش کرے۔ ایسے ہمدرد کی صورت میں، جو اُن مشکلات کو اپنی مشکلات خیال کرتا ہے اور ان کو حل کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ ہے۔ تدریس کی کامیابی کا راز یقیناً اسی میں ہے۔

اُستاد اگر لڑکوں کے کھیل تفریح میں وقتاً فوقتاً شامل ہوتا رہے، فرض منصبی کو ادا کرنے کی غرض سے نہیں، بلکہ ارادتاً کھیل میں حصہ لینے کی غرض سے، تو اس سے اُستاد کے کام میں اور بھی آسانیاں ہو جائیں گی۔ لڑکے اُستاد کی سعی و جہد پر زیادہ توجہ دینگے۔

اُستاد کا ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ طلبہ میں تخیل کی قوت پیدا کرے۔ اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو طلبہ کی سطح پر لے آئے اور موضوعِ تعلیم پر بالکل طلبہ کی طرح نظر ڈالے۔ اگر طلبہ کو تعلیم دیتے وقت اُستاد اپنے زمانہ، طالب علمی کو پیشِ نظر رکھیں اور اپنی اس وقت کی مشکلات کو یاد کرسکیں، جو خود انھیں

تدریس کے وقت پیش آتی تھیں، تو طلبہ کی مشکلات بڑی آسانی سے حل ہو سکتی ہیں۔

بچے فطرتاً نقال واقع ہوئے ہیں، وہ استاد کی ہر حرکت کو دانستہ یا نادانستہ جذب کرتے جاتے ہیں۔ گویا جماعت اُستاد ہی کا آئینہ ہوتی ہے، جس میں اُستاد کا تلفظ، اُستاد کا اندازِ بیان، اُستاد کا عمل منعکس ہوتا رہتا ہے، اس لیے اُستاد کو لازم ہے کہ طالب علموں کے سامنے اچھی سے اچھی مثال پیش کرے۔ اگر اُستاد انگریزی کا درس دیتا ہے، تو اس کو یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اُس نے بی اے کی سند حاصل کر لی ہے۔ یہ سند تو عقل و فراست کی ابتدا ہے، اس کے لیے اُستاد کو اپنی علمی استطاعت پر مطمئن نہ ہو جانا چاہیے۔ اسے اپنی انگریزی کی مزید اصلاح کے لیے بیش از بیش سعی کرنا چاہیے اور اس سعی کے نتائج کا طالب علموں پر تجربہ کرنا چاہیے۔

اُستاد کو چاہیے کہ طلبہ کی جماعت میں بھی دلچسپی لے اور موضوعِ تعلیم میں بھی۔ اگر اُستاد پوری گرمجوشی کے ساتھ جماعت میں دلچسپی لے، تو کوئی لڑکا پسند نہیں کریگا کہ وقت کو سو کر کھو دے، لیکن اگر ہم خود جماعت میں اونگھ رہے ہوں اور توقع یہ رکھیں کہ طلبہ بیدار رہیں، تو یہ توقع عقل و ہوش کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ لڑکے توجہ کے ساتھ سبق پڑھیں، تو ہمیں چاہیے کہ ہوشمندی کے ساتھ

سبق پڑھائیں۔ ہمیں یہی نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ چونکہ ہم ٹریننگ کالج سے فارغ ہو لیے ہیں، اس لیے ہم ہر قسم کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر کامل اُستاد بن چکے ہیں۔ غالباً یہ تعلیم، جو ہم نے یہاں حاصل کی ہے، ہم یہیں چھوڑ جائیں گے۔ آئندہ زندگی میں واقعات مختلف ہونگے، ماحول مختلف ہوگا اور اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تدبیریں بھی ہمیں مختلف اختیار کرنا ہونگی۔ دنیا کے واقعات تیزی کے ساتھ بدلتے جا رہے ہیں۔ تعلیمی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نئے نئے طریقوں کی آزمائش ہو رہی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بھی ان طریقوں کا تجربہ کریں۔ جماعت ہماری تجربہ گاہ ہے۔ ہمیں اس پر تعلیمی تجربات کرنا چاہییں۔ پامال راستوں پر ہی چلتے رہنا زیادہ سود مند ثابت نہیں ہو سکتا۔ ایک زیرک اُستاد ہمیشہ ایسے طریقوں کی ٹوہ میں رہتا ہے، جو مضمون کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور مفید بنا سکیں۔ ہمیں یہ اندیشہ نہ ہونا چاہیے کہ یہ طریق نیا ہے، اس کا تجربہ کبھی نہیں کیا گیا۔ ہم میں اتنی جرأت ہونا چاہیے کہ ہم بے خوف ہو کر نیک نیتی سے اس طریق کا تجربہ کریں۔

بچّے کی نفسیات

دنیا میں کوئی چیز ایک حالت پر قائم نہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں، ہر دم کچھ نہ کچھ تبدیلی اور تغیر ہوتا رہتا ہے۔ جس چیز میں تغیر پذیر ہونے کی صلاحیت باقی نہ رہے، سمجھ لیجیے کہ وہ مردہ ہو گئی۔ قدرت کا یہ قانون جیسے جمادات، نباتات اور حیوانات پر عائد ہوتا ہے، اسی طرح اُن کے آس پاس کی کیفیات اور حالات پر بھی حاوی ہے۔ تعلیم ہی کو لیجیے، تو یہ بات بہت وضاحت سے نگاہ کے سامنے آجاتی ہے۔ جن افراد کی تعلیم کالج اور یونیورسٹی کی ڈگریوں کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور جس میں کوئی ترقی اور تبدیلی نظر نہیں آتی، وُہ دماغی طور پر مردہ ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں بدقسمتی سے بہت سے آدمیوں کی دماغی موت یونیورسٹی سے ڈگری ملتے ہی ہو جاتی ہے۔ اب افراد سے بڑھ کر خاندانوں کو دیکھیے، تو معلوم ہوگا

کہ جس خاندان کے افراد نے آباواجداد کے علم سے زیادہ علم حاصل نہیں کیا، وہ رفتہ رفتہ اس علم کو بھی جلد ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ رفتار کا رُک جانا اور ایک ایسا جمود پیدا ہو جانا، جو رفتار کی قوت کو سلب کرلے، درحقیقت کیفیتِ موت کی ابتدا ہے۔ افراد اور خاندان سے بڑھ کر اقوام اور سماج کو دیکھیے، تو وہاں بھی یہی تماشا نظر آئے گا۔
جب اقوام اور سماج کو اپنے اسلاف کے ذخیرے پر ناز ہو جائے اور دوسروں کا علم اس قابل نظر نہ آئے کہ اس سے فائدہ اُٹھائیں، صرف اس لیے کہ نئے نئے علم نَو دولتوں کی طرح قابلِ اعتماد نہیں ہوتے، تو ان پر جمود طاری ہو جاتا ہے۔ قوم اور سماج کی دماغی موت کی ابتدا یوں ہوتی ہے، مثلاً: ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ جب مغربی علوم ہندوستان میں آئے، تو مسلمان یہی کہتا رہا کہ یہ علوم باطل ہیں، میرے آباواجداد کا ذخیرۂ علم مُنتہائے کمال کو پہنچ چکا ہے اور وہ میرے لیے کافی ہے۔ اِس واہمے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے علوم کی تحصیل کی دوڑ میں تیز گام مسلمان سب سے پیچھے رینگتا نظر آیا، یعنی، افراد اور خاندانوں کی طرح ایک سماج دماغی موت کا شکار ہو گئی۔ دماغی موت جسمانی موت سے کہیں زیادہ اندوہناک ہے، لیکن جب افراد اور خاندانوں سے بڑھ کر یہ ناگہانی موت سماج کو شکار کر لیتی ہے، تو اس اندوہناک تباہی کی کوئی حد نہیں رہتی۔
جسمانی امراض کی تشخیص و تدبیر ڈاکٹر اور طبیب کرتے ہیں۔ اسی طرح دماغی

امراض کی روک تھام ایک سماج کے تعلیمی رہنما اور مدرسین کر سکتے ہیں۔ اگر طبیب
اپنے فرض سے غافل ہے، تو ممکن ہے کہ مرض بڑھ کر لاعلاج ہو جائے۔ اسی طرح
اگر تعلیمی رہنما اور مدرس اپنے فرض سے غافل ہے، تو ممکن ہے کہ دماغی امراض بڑھ
کر دماغی موت کا سبب بن جائیں۔ فرد کی زندگی مختصر ہے، اس لیے اس کے امراض
بھی جلد زور پکڑ جاتے ہیں اور طبیب کو تشخیص میں واضح علامتیں آسانی سے مل جاتی
ہیں، لیکن سماج کی زندگی تقریباً چار سو پانچ سو سال ہے، اس لیے سماج کے دماغی
امراض کی علامتوں سے آگاہ ہونا ساٹھ ستر سال زندہ رہنے والے کے لیے آسان
نہیں۔ جب خطرہ اس درجہ صریح اور تشخیص اس قدر مشکل ہو، تو معلّمین اور مدرسین کا
فرض ہے کہ وہ ہر وقت چوکنے رہیں۔ سماج کی نبض پر ان کی انگلیاں ہوں اور
سماج کے چہرے پر اُن کی نگاہیں جمی رہیں، تاکہ صحت قائم اور زندگی برقرار رہے
اور سماج قدم بڑھائے چلے۔

آپ پوچھیں گے کہ سماج کا چہرہ کیا ہے؟ اس کی نبض کہاں ہے اور اس ہمیشہ
کی دیکھ بھال کا کیا مطلب ہے؟ آپ کے مدرسوں میں پڑھنے والے بچے ہی سماج کا
چہرہ ہیں اور یہی سماج کی نبض، اگر ان میں زندگی موجود ہے اور آپ اس کو برقرار رکھ
سکے ہیں، تو آپ خوش نصیب ہیں اور آپ کا کام مبارک ہے، ورنہ معاملہ اس کے
برعکس۔ آپ کا کام ہے کہ آپ ہر وقت ہوشیار رہیں اور نہ صرف سماج کو خطرات

سے محفوظ رکھیں، بلکہ اُس کی بالیدگی کے ضامن بنیں۔

اِس اجمال کی تفصیل یوں کی جا سکتی ہے کہ تعلیم میں تبدیلیاں تین طرح واقع ہوتی ہیں: اوّل تبدیلی موضوع کی ہے۔ ایک زمانے میں مذہبی تعلیم ہی اصلی تعلیم تھی۔ یورپ کے زمانۂ وُسطیٰ کی تعلیم کا موضوع صرف مذہب تھا۔ ہر چیز جو متناقض تھی، اُس کو فوراً اس دور کے معلّمین نے جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا۔ یُونان اور روم کا علم اس مذہبی دور کے ہاتھوں یورپ سے چلا ہی گیا تھا، بعد میں عربوں کے وسیلے سے واپس یورپ پہنچا۔ بہرحال یہاں اس بحث کا موقع نہیں، یہاں صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف قسم کے مضامین، مختلف اقدارِ حیات، تعلیم کا موضوع رہے ہیں۔ معلّمین کا ان تبدیلیوں میں بہت کچھ ہاتھ رہا ہے، لیکن اصلی ذمے داری سماج ہی کی رہی ہے۔ سماج کی زندگی کا ہر پہلو مِل جُل کر یہ تبدیلیاں کرتا رہا ہے اور کرتا رہیگا۔

دوسری قسم کی تبدیلی جو کسی سماج کی تعلیم میں رونما ہوتی رہی ہے، وہ بھی مدرسین کے قبضے سے بہت حد تک باہر ہے۔ اس کی وضاحت مثال سے بہ آسانی ہو سکتی ہے۔ یونان کی تعلیم میں ایتھنز کو لیجیے، تو ایک زمانے میں انفرادی زندگی کی تکمیل اس کا مقصدِ اوّلیں تھا یا اسپارٹا کی تعلیم کو لیجیے، تو وہاں صرف مشین کا ایک پرزہ تھا، جس کی زندگی کی صرف ایک ہی دلیل ہو سکتی تھی کہ وہ "ریاست"

کے لیے زندگی گزارے یا اب دورِ موجود میں دیکھیے، تو بعض ممالک مثلاً، جرمنی اور اٹلی سلطنت ہی کو مقدم سمجھتے ہیں اور ان کا نظامِ تعلیم، ان کے مدرسے، کالج اور یونیورسٹیاں، نیز ان کے مدرسین سب اسی مقصد کے حصول کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ یا پھر روس کی جمہوریہ کو لیجیے اور اس کا مقابلہ امریکہ کی جمہوری سلطنت ریاستہائے متحدہ سے کیجیے، تو بات ظاہر ہو جائیگی کہ سلطنت کا ایک مقصد ہوتا ہے اور نظامِ تعلیم اس مقصد کے حصول میں آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ تعلیمی گاڑی سیاسی رتھ کے پیچھے بندھی ہوئی جھولتی جھالتی چلی جاتی ہے۔ جہاں سماج اور سلطنت ایک ہیں، وہاں اس کے نقائص نہیں رہتے، مگر جہاں سماج اور سلطنت کے بنیادی اصولوں میں فرق ہو، وہاں اکثر نظامِ تعلیم سے اس درجہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا، جتنا بصورتِ دیگر ہونا ممکن ہے۔ بہرحال یہ دلچسپ بحث لمبی ہے اور یہاں اس کا موقع نہیں۔ یہاں تو صرف اس قدر بتا دینا ضروری ہے کہ تعلیم میں دوسری قسم کی تبدیلی اس کی "نوعیت اور اطلاق" میں ہوتی ہے۔

تیسری تبدیلی سے ہم مدرسین کا رشتہ بہت گہرا ہے، کیونکہ یہ تعلیم کے حصول کے ذرائع سے متعلق ہے۔ مقصدِ تعلیم کی تعیین کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مقصد کو کیونکر حاصل کیا جائے اور یہ فرض مدرسین کے ذمے ڈال دیا جاتا ہے کہ وہ ایک دستور اور طریقہ اختیار کر لیں، جس میں کم سے کم کوشش سے بہتر سے

بہتر نتائج حاصل ہو سکیں۔ یہ بحث بھی بہت طویل اور بے حد دلچسپ ہے۔ یہاں اس کے ایک حصّے پر نہایت ہلکی سی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائیگی اور وہ یہ ہے کہ بچے اور اُستاد، متعلّم اور معلّم میں کیا فرق ہونا چاہیے؟

چالیس پچاس سال کی بات ہے کہ باپ بچے کو مدرسے میں داخل کرتا، تو اُستاد سے کہتا کہ صاحب ہڈیاں اور جان ہماری، گوشت پوست آپ کا۔ یہ بچہ آپ کے سپرد ہے، آپ جو چاہیں بے دریغ کریں۔ اِس "وصیت" کا اثر کچھ بھی ہوتا ہو، لیکن درحقیقت یہ اس بات کا اعلان تھا کہ بچّے کو پڑھانے کے لیے مار پیٹ اور استبداد بہت ضروری ہے اور اُستاد کو حق حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے مارے پیٹے اور بچے کو پڑھا دے۔

دوسری بات جو اس سے اخذ کی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ بچہ ایک برتن ہے اور اس برتن میں علم کی جنس کوٹ کوٹ کر بھر دینی چاہیے۔

تیسری بات اسی ضمن میں یہ ہے کہ اس چوکور برتن میں اگر جنس علم، جو خواہ مدوّر ہو یا مستطیل، بھرنے میں دقّت ہو، تو بے فکری کے ساتھ چوکور کنارے جھاڑ دیے جائیں اور وہ "غیر صورت" جنس اس میں بھر دی جائے۔

چوتھی بات جو اخذ کی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ بچے کی ضروریاتِ دماغی کا اندازہ ایک بڑی عمر کے انسان کے نقطۂ نظر سے کیا جائے، یعنی، یہ فرض کر لیا جائے

کہ جو بات بڑے کے نزدیک بھی دلچسپ ہے، وہ بچے کے نزدیک بھی دلچسپ ہونی چاہیے۔ ان چار اصولوں کے خلاف صدیوں سے احتجاج کی آوازیں بلند ہوتی رہی ہیں (سب سے اوّل افلاطوں نے کہا: "نہیں، بچے کی دماغی حیثیت اور اُس کی شخصی نفسیات کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس کے مطابق تعلیم دینی چاہیے۔" امام غزالی نے بھی اسی بات کو کئی سو سال بعد، مگر افلاطوں سے زیادہ وضاحت سے پیش کیا اور اب پچھلے تین چار سو سال میں تو بہت سے مفکرین نے بچے کے نفسیاتی مطالعے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ روسو، فروبل، پسٹا لوزی، میڈم مونٹ سوری اور پروفیسر ڈی وی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان مشاہیر کے کہنے سُننے پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سماج کی اس موجودہ حالت میں، جب کہ تعلیم صرف مذہبی نہیں رہی، بلکہ بے انتہا مادّی ہو گئی اور تھوڑی جماعت کے لیے محدود نہیں رہی، بلکہ عام ہو گئی اور ہمہ گیر ہو جائیگی اور جب کہ تعلیم، انسانی علم کے ذخیرے سے بڑھ جانے سے، بے انتہا پیچیدہ اور گوناگوں ہو گئی ہے، مدرّس کے لیے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ وہ پُرانے اصولوں پر نظرِ ثانی کرے اور نئی نئی مشعلوں کی روشنی میں اپنے اور متعلّم کے راستے کو دیکھے تاکہ ہر قدم صحیح اور پورا پڑے اور جلد اُٹھ سکے۔)

یقین کیجیے کہ بچہ ایک شخصیت رکھتا ہے۔ اس کی یہ شخصیت آپ کی اور میری شخصیت سے مختلف ہے۔ وہ ایک مُسن یا جوان آدمی کے نقطۂ نگاہ سے

چیزوں کو نہیں دیکھتا، اس لیے اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ اس "تعلق تدریسی و تعلیمی" کو مفید بنائیں، تو بچے کی شخصیت کا مطالعہ کیجیے، اپنے اور اس کے درمیان وہ رابطۂ اتحاد قائم کر لیجیے کہ وہ آپ کو راستے سے واقف راہبر تسلیم کر لے۔ بچے کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ :

ا۔ کہے اور بات سُنے۔

ب۔ کچھ نہ کچھ کرتا رہے۔

ج۔ ناچے کُودے اور گائے بجائے۔

د۔ کچھ نقش و نگار بناتا رہے۔

ہ۔ ہر چیز کے متعلق معلوم کرے کہ یہ کیوں اور کس لیے ہے۔

و۔ چیزیں بنائے، کیونکہ تعمیر بچے کی سرشت ہے۔

آپ روزمرہ کی تدریسی زندگی میں بچوں کو موقع دیا کیجیے کہ وہ متذکرۂ بالا خواہشات پوری کر سکیں اور اُن کی زندگی اُن کے ماحول کے مطابق نشو و نما پاتی رہے، تاکہ کل اُنھیں یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ اُن کی خامیاں ہماری کوتاہ اندیشی کا نتیجہ ہیں۔

مدرسہ اور اخلاقی تعلیم

ہندؤں اور مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ہندوستان میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم، عام تعلیم کا ایک ضروری جُز سمجھی جاتی تھی۔ ہر پاٹ شالے اور مکتب میں نوشت وخواند اور ابتدائی حساب کے ساتھ ساتھ دینیات کی تدریس کی جاتی تھی۔ فرنگی اقوام کے ہندوستان میں آنے تک یہ رواج عام تھا۔ سترھویں صدی میں جب فرنگی قوموں نے ہندوستان میں اپنی تجارتی کوٹھیاں کھولیں اور رفتہ رفتہ کچھ ساحلی علاقوں پر اقتدار حاصل کرلیا، تو انھوں نے بھی عیسائی مذہب کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے جگہ جگہ مدارس قائم کیے۔ چنانچہ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں انگلستان، فرانس، ڈنمارک، پرتگال اور دوسرے یورپین ممالک سے عیسائی پادری یہاں آئے اور جنوبی ہندوستان کے مختلف مقامات پر تبلیغ کی غرض سے مدرسے قائم کیے اور یورپین تاجروں

کی طرح، ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی بھی عیسائی مذہب کی اشاعت میں نمایاں حصہ لیتی رہی، لیکن جوں جوں کمپنی کے مقبوضات وسیع ہوتے گئے، اسی قدر مذہبی بدگمانیاں ترقی کرتی گئیں اور یہ خوف لاحق ہوگیا کہ کہیں عیسائی مذہب کی اشاعت سے سلطنت کی روز افزوں ترقی کو نقصان نہ پہنچ جائے، اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی مذہبی اشاعت کی پالیسی کو ترک کر دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ حکومت کو کسی مذہب کی سرپرستی اور حمایت سے سروکار نہیں۔ نیز ہندوستان کے کسی مذہب کی تدریس و تعلیم کو مدارس میں جاری رکھنے یا رائج کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ مذہبی غیر جانبداری کی پالیسی کا اثر تعلیم پر یہ ہُوا کہ ہندو اور مسلمان بچّے اپنے اپنے مذاہب کے ان اسباق سے بے بہرہ رہنے لگے، جو پہلے ان کی اخلاقی تعلیم کے منبع تھے۔

لارڈ منٹو نے ۱۸۱۱ء میں اس پالیسی کے اعلان اور نفاذ کے کچھ مدّت بعد کمپنی کے ڈائرکٹروں کو ایک مراسلے میں لکھا کہ ہندوستانی نظامِ تعلیم میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا فقدان بُرے نتائج کا باعث ہوگا اور اس لیے حکومت کو باوجود مذہبی غیر جانبداری کی پالیسی کے، اپنی "رعایا" کی اخلاقی تعلیم کا کچھ نہ کچھ انتظام ضرور کرنا چاہیے۔ ملک کے مختلف حصّوں میں سربرآوردہ ہندوستانیوں نے بھی اس مراسلے کی تائید کی اور تائید و طلب کا یہ سلسلہ تقریباً تیس سال تک متواتر جاری رہا۔ آخرکار ۱۸۴۰ء میں حکومت نے اخلاقی تعلیم کو رائج کر دینے کا اعلان کیا، لیکن اس کے ساتھ

یہ بات واضح کردی کہ اخلاقی تعلیم، مذہبی تعلیم کا جُز نہیں قرار دی جاسکتی۔ البتہ اخلاقی تعلیم ایک علیحدہ مضمون، یعنی فلسفۂ اخلاق کے زیرِعنوان داخل نصاب کی جائیگی، یہ زبانی جمع خرچ ہوتے رہے، لیکن حکومت نے اس نیک ارادے کو عملی جامہ نہ پہنایا۔

اخلاقی تعلیم کے معاملے میں سر چارلس وڈ کے مشہور تعلیمی مراسلے مورخہ ۱۸۵۴ء کی تشنگی مزید محرومی کا باعث ہوئی، یعنی مذہبی اور اخلاقی تعلیم پر سرکاری اور امدادی مدارس کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کردیے گئے، لیکن تقریباً پچیس برس کے بعد، یعنی ۱۸۸۲ء میں یونیورسٹی کمیشن نے اس قصّے کو پھر چھیڑا اور سفارش کی کہ مدارس میں اخلاقی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور اس غرض کے لیے کتابیں لکھی جائیں، لیکن حکومت نے اس سفارش کو منظور نہ کیا اور ہندوستان کے مدارس میں اخلاقی تعلیم کے لیے کوئی گنجائش نہ پیدا ہوسکی۔

ہمارے نظامِ تعلیم سے اخلاق کی تعلیم کے اس طرح جلاوطن کیے جانے کے نتائج اور اثرات آج ہماری سماجی زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں ہیں۔ میرا یہ ارادہ نہیں کہ ان اثرات کا تفصیل کے ساتھ محاسبہ کروں، لیکن مَیں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مذہب و اخلاق سے بے تعلق ہونے کے باعث ہماری تعلیم "بے دین" سی ہو کر رہ گئی ہے۔ جس کے باعث بالعموم افراد اپنے حقوق کے مطالبات تو کرنا جانتے ہیں، لیکن اپنی سماجی ذمّے داریوں کا بوجھ اُٹھانے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔

ملک کی موجودہ حالت کو مدِّنظر رکھتے ہُوئے اور خارجی اثرات کی بے پناہ چیرہ دستی کو دیکھتے ہُوئے یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ مستقبل قریب میں ہمارے نظامِ تعلیم میں اخلاقی تعلیم شریک کی جائیگی۔ اس لیئے ظاہر ہے کہ اس محرومی کو دُور کرنے کی ذمّے واری مدرسے پر ہی عائد ہوتی ہے۔

مدرسہ اس معاملے میں کیا کر سکتا ہے؟

ہر اچھے مدرسے کی ایک شخصیت ہوتی ہے، یعنی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں، جن کے باعث ایک مدرسہ دوسرے مدرسے سے ممتاز یا کم از کم مختلف ضرور ہوتا ہے۔ مدرسہ صرف عمارت ہی کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ماحول ہے، جو ہیڈ ماسٹر، مدرسین، طلبہ، مدرسہ کی عمارت اور کھیل کے میدان وغیرہم پر مشتمل ہے۔ یہ ایک ایسا ماحول ہے، جہاں طلبہ کو زندگی کے تجربات سے دوچار ہونے کے مواقع بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ جہاں کتابیں پڑھائی جاتی ہیں تاکہ علم انسانی کا ذخیرہ نئی نسلوں کے لیے مفید ہو سکے، جہاں سائنس کے تجربات کیے جاتے ہیں تاکہ علم انسانی میں ترقی ہو اور جسمانی صحت و بالیدگی کے لیے مشاغل بہم پہنچائے جاتے ہیں تاکہ آئندہ نسلیں تندرست اور تنومند بن جائیں، اس لیے یہاں لازمی طور پر جسمانی اور دماغی قوتوں کو بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی ہونی چاہیے کہ طلبہ میں اپنے جذباتی تجربات کے ذریعے اپنے گرد و پیش یعنی سماج سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور

انھیں ایسی زندگی بسر کرنے کا موقع ملے کہ وہ بآسانی دوسروں کے نقطۂ نگاہ، دوسروں کے جذبات، دوسروں کی خواہشات اور مشکلات کو سمجھ سکیں اور ان کے عقائد کا احترام کر سکیں۔

ان اخلاقی مقاصد کے حصول کے لیے کسی خاص نصاب کی تدریس ضروری نہیں۔ ہر مدرس کی روزمرہ کی زندگی، اس کے اقوال اور افعال طلبہ کی اخلاقی تعلیم کا باعث بن سکتے ہیں۔ اگر ایک مدرس سبق کے لیے پوری طرح تیار نہیں ہوتا، ہر چیز کو سہل انگارانہ دیکھتا ہے، حرکات و سکنات میں سُستی اور کاہلی کو روا رکھتا ہے، لباس کی صفائی اور باقاعدگی کو مدِّ نظر نہیں رکھتا، یا مختصراً یوں کہیے کہ "نشاطِ کار" سے ناآشنا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کے طلبہ میں بھی ایسی کوتاہیوں اور کمزوریوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔ صرف اخلاقی اصولوں کی تدریس کبھی مفید نہیں ہوتی۔ البتہ اخلاقی زندگی کی 'تعلیم' نہایت درجہ کامیاب ہو سکتی ہے اور اُس کا سب سے آسان ذریعہ یہی ہو سکتا ہے کہ مدرسے کا ماحول 'حقیقت اور انسانیت' کا سبق دے۔ میرا خیال ہے کہ مدرسین اپنی روزمرہ کی زندگی میں یہ چند باتیں مدِّ نظر رکھ کر طلبہ کی کامیاب اخلاقی تعلیم کر سکتے ہیں:

ا۔ طلبہ سے تعلقات میں سچائی اور راستبازی۔

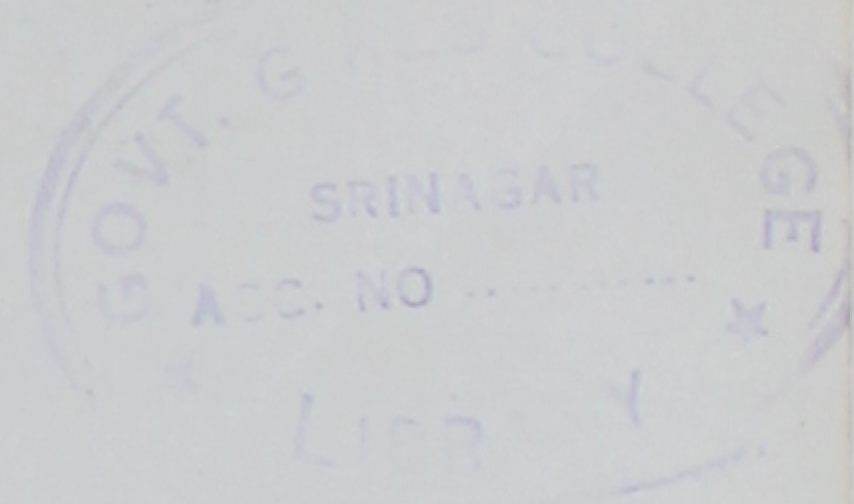
ب۔ اپنے فرائض کی ذمّےدارانہ تکمیل۔

ج- قوتِ فکر کا آزادانہ استعمال اور قوتِ عمل پر اعتماد -

د- جسمانی تکالیف اور مصائب کی طرف سے بے پرواہی -

ھ- دوسروں کے عقائد اور جذبات کا احترام -





بچّے کی پسند اور ناپسندی

آپ نے اپنے دوستوں کو اکثر یہ کہتے سنا ہوگا کہ فلاں شخص وعدے کا پکّا ہے، فلاں شخص کی بات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک نہایت ہمدرد انسان ہے، دوسرے کو اپنے عزیزوں کا بھی خیال نہیں۔ ایک شخص اپنے فرائض کے ادا کرنے میں غیر معمولی طور پر مستعد ہے، دوسرا اپنے فرض منصبی جیسے تیسے پورا کرتا ہے، لیکن کبھی آپ نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ ایک ایسا اور ایک ویسا کیونکر بن جاتا ہے۔ روزمرّہ کی زندگی میں طرح طرح کے انسانوں سے ملنے اور برتنے سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ آدمی، آدمی اپنے عادات، اخلاق، اطوار میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

یہ کیوں؟

آپ فرمائیں گے، یہ تربیت اور گردوپیش کا اثر ہے۔ بیشک درست ہے، لیکن تربیت اور ماحول ایسے وسیع الفاظ ہیں کہ اُن سے اصلی صورتِ حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ ماں باپ اور مدرس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اولاد اور اپنے شاگردوں کی شخصیت کی تعمیر اور تشکیل کے اسباب اور وجوہ پر غور کرے اور صرف یہ کہہ کر کہ تربیت اور ماحول کے اثر سے شخصیت بنتی ہے، مطمئن نہ ہو جائے۔

آئیے، ہم اس موضوع کا سرسری اور اجمالی مطالعہ کریں۔

حضرت ابراہیمؑ پیغمبر کے بچپن کا مشہور قصہ آپ نے سُنا ہوگا۔ ابراہیمؑ نے ستاروں کو دیکھا۔ اُن کی چمک، اُن کی ٹھنڈی روشنی، ان کی دلفریب جھجھماہٹ سے اس درجہ اثر پذیر ہوئے کہ بولے۔ میرے دیوتا اور خدا یہی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد چاند نمودار ہُوا۔ ستارے اس کے سامنے ماند پڑنے لگے۔ رات کی تاریکی منور ہو گئی، گردوپیش کی چیزیں چاندی کی سی بن گئیں۔ ابراہیمؑ نے اپنے دل سے کہا۔ نہیں، ستارے میرے دیوتا نہیں ہو سکتے۔ میرا دیوتا تو چاند ہے۔ پھر چاند دیوتا بنا رہا۔ رات ختم ہوئی، سورج نمودار ہوا اور ابراہیمؑ کی طفلانہ آنکھوں نے چاند کی شکست اور سورج کی فتح کا تماشا دیکھا، وہ فوراً بول اُٹھے۔ نہیں، چاند میرا خدا نہیں۔ سورج میرا خدا ہے۔ آخر سورج بھی

غروب ہوا اور وہی روز و شب کا تماشا پھر ہونے لگا۔ ابراہیمؑ نے ان فنا ہونے والی چیزوں کو اپنے دیوتا گرداننے سے انکار کر دیا اور فیصلہ کیا کہ ان سب پر قدرت رکھنے والا ہی میرا خدا ہو سکتا ہے۔

اس طرح حضرت ابراہیمؑ پیغمبر کی شخصیت کی تکمیل ہوئی۔

اب آپ اپنی اولاد اور اپنے طلبہ پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بچے سپاہی بنتے ہیں۔ سچ مچ کے سپاہی کی طرح باز پرس اور دار و گیر کرتے ہیں۔ اپنے نقلی ملزم کو پکڑ کر عدالت میں لے جاتے ہیں اور حتی الامکان اصلی سپاہی، داروغہ اور مجسٹریٹ کی اچھی خاصی نقل کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھی بچے دکان لگاتے ہیں، سودا فروخت کرتے ہیں۔ گاہک آتے ہیں، مال خریدتے ہیں۔ ناپ تول ہوتی ہے۔ غرضکہ سوداگری کے بیشتر مراحل طے کیے جاتے ہیں۔ روزمرہ کا کھیل بچوں کے گرد و پیش کا چربہ ہوتا ہے۔ جانداروں کے افعال کی نقل کے علاوہ کبھی کبھی بے جان چیزوں کی بھی نقل ہوتی ہے۔ جہاں گھوڑا بن کر بچوں کو آپ نے ہنہناتے دیکھا ہو گا، وہاں انجن بن کر کُو پھک پھک بھی کرتے سُنا ہو گا۔ مَیں ایسی بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ آپ کے مشاہدے میں بھی ایسی بیسیوں چیزیں موجود ہیں، لیکن یہ مشاہدہ ہی کافی نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچے ایسا کیوں کرتے ہیں۔ عام آدمی کہے گا کہ

کھیلتے ہیں اور بچے حقدار ہیں کہ جو چاہیں کھیلیں۔ یہ درست ہے کہ بچے کھیلتے ہیں، لیکن اُن کا کھیل اُن کے گرد و پیش کی چیزوں، یعنی، اُن کے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ انسانی مزاج کا خاصہ ہے کہ ہر پسند آنے والی چیز کی نقل کرے۔ یہ نقل اُتارنے کا مادہ اور خواہش ہمارے حسیات اور جذبات کی تعمیل میں کارفرما ہوتا ہے، یعنی

ا۔ ہر بچہ نقل کرتا ہے۔

ب۔ یہ نقل اپنے گرد و پیش اور ماحول کی ہوتی ہے۔

ج۔ ماحول میں صرف وہ چیزیں نقل کے لیے انتخاب کی جاتی ہیں، جن سے بچہ پسند اور ناپسندی کا تعلق رکھتا ہو۔

د۔ پسند اور ناپسندی کا انحصار بہت حد تک، بلکہ قطعی طور پر جذبات اور حسیات پر ہوتا ہے۔

اس لیے ماں باپ اور مدرّس کے لیے یہ لازمی ہے کہ بچے کی پسند اور ناپسندی کا مطالعہ کرے اور صحیح قسم کی چیزوں سے محبت اور غلط قسم کی چیزوں سے منافرت کے اسباب مہیّا کرے۔ شخصیت کی تشکیل اور تعمیر مسلسل رَو ہے۔ یہ روز بروز بنتی اور بگڑتی رہتی ہے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے یہ تماشا ہوتا رہتا ہے، لیکن بالعموم ہماری آنکھیں اس تماشے کو دیکھ نہیں سکتیں، صرف

اس وجہ سے کہ دیکھنے کی زحمت برداشت نہیں کرنا چاہتیں۔ تعلیم کا ایک اہم مقصد تربیت بھی ہے اور میرا خیال ہے کہ جذبات کی تربیت ہی سے شخصیت کی تربیت ممکن ہے۔

آج کے بچے کل قوم کی سرداری کریں گے، یعنی، قوم کی تشکیل اور تعمیر بچوں کی شخصیت کی تعمیر اور تشکیل پر منحصر ہے اور جو بچے محبت اور نفرت کے صحیح استعمال پر قدرت نہیں پا سکتے، ان کی قوم بھی محبت اور نفرت کے صحیح استعمال پر قدرت نہیں پا سکے گی، لیکن یہ محبّت اور انفرادی وجوہ پر نہ ہو، بلکہ سچ اور جھوٹ کی شناخت پر۔ سچ سے اس لیے محبت ہو کہ سچ محبت کے قابل ہے اور نفرت اُس وقت بروئے کار آئے، جب اس کی ضرورت ہو۔ باغبان اپنے باغ سے بیگانہ اور غیر ضروری چیزوں کو اُکھاڑ پھینکتا ہے، اس لیے نہیں کہ اُن سے نفرت کرتا ہے، بلکہ اس لیے کہ جن پودوں سے وہ محبت کرتا ہے، اُن کی پرورش اور نشو ونما کے لیے سبزۂ بیگانہ کا نہ ہونا ہی ضروری ہے۔

بچوں کی شخصیت کی تشکیل اور تعمیر میں اگر یہ اصول کارفرما ہو، تو اُمید کی جا سکتی ہے کہ افراد قوم کی قوت کا باعث بن جائیں۔ اس قسم کی شخصیّت کی تشکیل کی ذمّے داری بحیثیت والدین اور مدرّس ہم پر عائد ہوتی ہے اور اگر ہم فروگزاشت کرتے ہیں، تو مجرم ہیں اور ہمارے جرم کی سزا سخت ہو گی۔

تدریس اور تعلیم

ہمارے ملک میں تعلیم ابھی اتنی عام نہیں ہوئی، جتنا اسے ہو جانا چاہیے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تعلیم کی اہمیت کا احساس بہت عام ہو گیا ہے اور اب ہر شخص یہ تسلیم کرتا ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ہی اُن کی زندگی کا بہترین سرمایہ بن سکتی ہے۔ تعلیم کے رواج کے ساتھ ساتھ مشکلات بھی بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ چند نہایت ہی ابتدائی مراحل ابھی تک وضاحت کے محتاج ہیں، مثلاً: یہ سوال کہ تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہیے، ایک ایسا مسئلہ ہے، جو ابھی تک حل طلب ہے۔ کیا آپ فرما رہے ہیں کہ تعلیم کا مقصد روزی کمانا ہے؟ درست، لیکن کسبِ معاش تو تعلیمی مقاصد کا ایک اہم جز ہے، یہ تعلیم کا مقصد نہیں ہو سکتا۔ انسانی حوائج صرف پیٹ ہی سے متعلق نہیں۔ ہمارے مذہبی، جذباتی

اور جمالیاتی حوائج بھی بے انتہا ضروری ہیں اور انھیں کا وجود انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز ہے۔

ایک اور پہلو پیشِ نظر لایا جاتا ہے۔ آج ایک بڑی جماعت یہ کہہ رہی ہے کہ ہندوستان زراعتی ملک ہے، یہاں کی تعلیم کا مقصد زراعت کا فروغ ہونا چاہیے۔ یہ ارشاد بھی بجا ہے، لیکن آج کی صنعتی دنیا میں اسے نفع کا سودا نہیں کہا جاسکتا اور تعلیم کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوسکتا کہ نقصان ہی نقصان کا سودا کیا جائے۔

ایک تیسرا سوال ملاحظہ فرمائیے۔ تعلیم لڑکوں کے لیے ضروری ہے۔ کسبِ معاش اس کا اہم مقصد ہے۔ کیا لڑکیوں کے لیے بھی ایسا ہی نظامِ تعلیم معین کیا جائے، جس کا ایک اہم مقصد کسبِ معاش ہو؟

حدیثِ دلکش و افسانہ از افسانہ مے خیزد

مجملاً یوں سمجھیے کہ تعلیم کی نوعیت اور نصاب کی نوعیت کے متعلق ابھی کوئی فیصلہ کن بات پیشِ نظر نہیں۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ یہ امور ایک بار فیصل ہو جانے کے بعد پھر نظرِ ثانی کے محتاج نہیں رہتے۔ ضرور رہتے ہیں۔ البتہ کام کی ابتدا کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی اصلیت اور نوعیت سمجھ میں آجائے۔ منزلِ مقصود کا تعین سفر کے پُرلطف اور کامیاب ہونے کا ضامن ہوسکتا ہے۔

منزلِ معین کیے بغیر سفر اور حرکت مہمل سی بات ہے۔ بہر حال یہ وہ اصولی امور ہیں، جو ہر مدرّس کے پیشِ نظر ہونے چاہییں، لیکن مدرّس کے نقطۂ نگاہ سے فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے لیے اس کے علاوہ اور چند امور بھی فوری توجہ کے قابل ہیں۔

فرض کیجیے کہ ایک مدرسے میں آپ ملازم ہیں۔ وہاں مقررہ نصاب کی تدریس ہوتی ہے۔ آپ کے سپرد اُردو یا انگریزی، تاریخ یا جغرافیہ، ریاضی یا سائنس کی تدریس ہے۔ کیا آپ کا کام صرف اسی قدر ہے کہ مقررہ کتابیں اور مقررہ مضامین طلبہ کے ذہن نشین کر دیں؟ کیا آپ کا کام صرف اسی قدر ہے کہ طوطے کے پنجرے کو سامنے رکھ کر اس پنجرے کے مقید طوطے کو صرف یہ رٹوا دیں "مٹھو بیٹے! نبی جی بھیجو" اور جب طوطے سے بات چیت کی جائے، تو وہ بے محابا "مٹھو بیٹے! نبی جی بھیجو" کی رٹ لگا دے؟ بالفاظِ دیگر کیا آپ کا مدعا اور فرض اس قدر ہے کہ آپ کے طلبہ مقررہ نصاب کو حسبِ ضرورت زبانی یا تحریری طور پر طوطے کی طرح پیش کر دیں۔ اس کا جواب ہر شخص نفی میں دیگا اور یہ کہے گا کہ تدریس کا یہ مقصد انتہائی مذموم اور ناکارہ ہے اور اس کا اختیار کرنا چشمِ بصیرت کی کوری ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر مضمون کے شریک نصاب ہونے کی اہمیت اور ضرورت سے کما حقہٗ طور پر واقف ہوں اور ان مضامین کی تدریس کرتے ہُوئے متعلق مضمون کی اہمیت اور ضرورت کو پیشِ نظر رکھیں۔ اُردو کی تدریس کا

صرف یہ مقصد نہیں کہ نوشت و خواند آجائے اور امتحان میں طلبہ کامیاب ہو جائیں۔ اس کا مقصد اس سے کہیں بالا اور ارفع ہے۔ ہر زبان ملت کی تہذیب اور اخلاق کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ قومی محسوسات کے اعلان کا واحد اور مکمل ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر مدرس اُردو کی تدریس کرتے ہُوے، ان اہم باتوں کو نظرانداز کردے، تو سمجھ لیجیے کہ وہ طوطے کو صرف 'مِٹھو بیٹے' رٹوا رہا ہے۔

تاریخ اور جغرافیے کی تدریس کا یہ مقصد نہیں کہ مقامات کا نام اور چند صلحناموں کی تاریخیں اور سَن نوک زبان ہو جائیں۔ ان کا مقصد تو یہ ہے کہ بنی نوع انسان کو ایک برادری تصور کر کے ان کے حالات، ان کی ضروریات، ان کی مالی مشکلات سے آگاہی حاصل ہو۔ آپ کا ایک عزیز سفر سے واپس اپنے وطن پہنچتا ہے۔ آپ گھنٹوں دریافت حالات و کیفیات میں لگا دیتے ہیں۔ کیا کیا گزری؟ کیا کیا دیکھا؟ کیا کیا کرتے رہے؟ سب کچھ تفصیل کے ساتھ معلوم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ ممکن ہے کہ تاریخ اور جغرافیے کا مدرّس طلبہ میں ایک ایسا شوق پیدا کردے کہ کرۂ ارض پر پھیلی ہُوئی مخلوق کے حالاتِ گزشتہ و موجودہ معلوم کرنے میں طلبہ کو وہی مسرت اور لذت حاصل ہو، جو اپنے اعزا و احبا کے خطوط پڑھنے اور اُن سے ملاقی ہونے پر ہوتی ہے۔

ریاضی اور سائنس، اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ کے رٹ لینے کا نام

نہیں۔ انسان ابتدائے آفرینش سے اپنے سوا تمام مخلوق عالم کو فتح کرنے اور اسے اپنی ضروریات اور مفاد میں صرف کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اس کوشش کا ماحصل ہمارا ریاضی اور سائنس کا علم ہے اور وجہ نظر نہیں آتی کہ ہمارے طلبہ اس علم کو خواہ وہ کتنا ہی ابتدائی کیوں نہ ہو، اپنی زندگی میں صرف کرنے کی صلاحیت نہ حاصل کرلیں۔

مختصر صورت یہ ہے کہ مدرّس تدریس کے دوران میں یہ ہر لمحہ مدِ نظر رکھے کہ مضامین کی تدریس ہی اس کا مقصد نہیں، بلکہ اس کی کوشش طلبہ کی تعلیم ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے، جب ہمارے مدرّس ہر مضمون کی اہمیت اور حیثیت سے خود نہایت اچھی طرح واقف ہوں اور اس وقوف کے بعد یہ کوشش کریں کہ حقیقی تعلیم وہی کہلا سکتی ہے، جس میں علومِ انسانی کو حیاتِ انسانی سے ہم آہنگ بنا دیا جائے۔

سماجی زلزلہ اور مدرّسین کا فرض

طوفانِ نوح کو ہزاروں سال ہو گئے، لیکن آج تک اس کی تباہ کاریاں ضرب المثل ہیں۔ بہار میں زلزلہ آیا، ہزاروں گھر برباد ہو گئے۔ ہندوستان کے چپے چپے میں اس کا ماتم کیا گیا۔ اس کے بعد کوئٹے میں زلزلہ آیا۔ اس کی داستانِ غم اب تک ہماری آنکھوں سے خراجِ اشک لیتی ہے۔ مٹ جانے والوں کو ہم رو رہے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک کوشش تعمیر بھی جاری ہے۔ بہار کے تباہ شدہ علاقوں میں بستیاں بس چکی ہیں۔ کوئٹہ پھر آباد ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مر جانے والوں کی جگہ اور مخلوق وہاں پہنچ پہنچ کر آباد ہوتی جا رہی ہے۔ ویرانے میں پھر شہر بنایا جا رہا ہے اور علم و عقل کی مدد سے وہ تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں کہ اگر زلزلہ پھر آئے، تو بربادی اور تباہی اتنی نہ ہو، جتنی پہلے ہو چکی ہے۔

آج دنیا کی سماج میں بھی زلزلے پر زلزلہ آ رہا ہے۔ سرمایہ دار، بندۂ مزدور کو ہر طرح بہلا پھسلا رہا ہے اور مزدور ببانگِ دہل کہہ رہا ہے کہ مجھے تمہاری تہذیب، تمہاری شائستگی، تمہارے فنونِ لطیفہ سے دلچسپی، تمہارا سرمایۂ علم و ادب کچھ نہیں چاہیے۔ میں صرف کپڑا چاہتا ہوں کہ تن ڈھک جائے۔ رزق چاہتا ہوں کہ پیٹ بھر جائے۔ سر پر چھت چاہتا ہوں کہ جسم کو فگار کرنے والی سرد ہوا اور گرم سموم سے محفوظ رہ سکوں۔ سرمایہ دار وعدہ کرتا ہے کہ محنت کر، یہ سب کچھ مل جائے گا۔ مزدور کہتا ہے کہ میرا صدیوں کا تجربہ ہے کہ صرف اتنا دو گے کہ میں فاقے سے مر نہ جاؤں، تاکہ تمہاری غلامی کے لیے زندہ رہوں اور بس، لیکن میں اپنا حصّہ چاہتا ہوں۔ یہ سرمایہ دار اور مزدور کا سماجی زلزلہ آج دنیا کے ہر ملک کو تباہ کیے ڈال رہا ہے۔

طوفانِ نوح کیوں آیا؟ بہار کا زلزلہ کیوں آیا؟ کوئٹے کا زلزلہ کیوں آیا؟ پہلی بات حیطۂ تاریخ و سائنس سے باہر ہے۔ آخری دو کے متعلق سائنسداں بیشمار وجوہ بیان کرتے ہیں۔ مجھے اور آپ کو یہ دماغ اور فرصت نہیں کہ ان وجوہ پر بالتفصیل غور کریں۔ البتہ ہم یہ جانتے اور سمجھ سکتے ہیں کہ قوانینِ قدرت کے ماتحت، نظامِ قدرت میں تبدیلیاں برپا ہوگئیں اور ہر چند کہ علم انسانی بے انتہا وسیع ہوگیا ہے، لیکن ابھی قدرت کے پورے کارخانے پر اُسے اقتدار حاصل نہیں۔ البتہ ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ دنیا میں سماجی زلزلہ کیوں آ رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس سماجی زلزلے کا باعث اقتصادی

پہاڑوں کا تبدیل مقام ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ طبقۂ "بارکش" میں حدّت اور گرمی بہت بڑھ گئی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ جنگِ عظیم کے جوالامکھی کے پھٹ جانے سے یہ سب قیامت برپا ہوئی۔ شاید یہ سب باتیں مل جل کر ذمّے دار ہیں، لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ موجودہ سماجی زلزلے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دنیا کا نظامِ تعلیم اور جمہوریت دست و گریباں ہیں۔

جمہوریت کیا ہے؟ کوئی نہیں بتا سکتا کہ جمہوریت کیا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ۔ آج کچھ اور کہتے ہیں، کل کچھ اور کہتے تھے۔ ہمارا معہود ذہنی ہر شے کے متعلق بدلتا رہتا ہے۔ اس لیے کہ دنیا کی ہر چیز خود بدلتی رہتی ہے۔ ہر چیز ترقی کرتے کرتے کچھ سے کچھ بن جاتی ہے یا پست ہوتے ہوتے نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ سماج کا ایک مظاہرہ اُس کی زندگی ہے اور وہ بھی تبدّل پذیر ہے، اس لیے جمہوریت بھی تبدّل پذیر ہے۔ یہ "تعلیم" کا کام ہے کہ جمہور کی نبض دیکھتی رہے، لیکن تعلیم نے اپنے آپ میں یہ صلاحیت پیدا نہیں کی اور موجودہ سماجی زلزلہ بہت حد تک اس لاعلمی کے باعث ہے۔ جب تک ہمارا نظامِ تعلیم سماجی تاثرات کو سمجھنے سے قاصر رہیگا اور جب تک ہمارا نظامِ تعلیم قاصر رہنے کے باعث ہر نئے دور میں پیدا ہونے والی نئی نئی سماجی ضروریات کو پورا کرنے کا اہل نہ بنے گا، سماج میں یونہیں زلزلے آتے رہیں گے۔

ضرورت یہ ہے کہ فرد کو اُس کے مختصر ماحول میں پرورش پانے دیا جائے اور سماج اُنھیں افراد کی خواہشات اور ضروریات کے مطابق ایک جمہوریہ تیار کرے۔ اس ہم آہنگی کے لیے ضرورت ہے کہ فرد اور سماج میں اس طرح تعلق پیدا کر دیا جائے کہ ہماری نوخیز نسلیں ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں سماج کی نبض دیکھنا سیکھ لیں۔ بیشک آج کل مدارس میں سماجی زندگی کے ہر پہلو پر کچھ نہ کچھ پڑھایا جاتا ہے اور سماجی تبدیلیوں کی معلومات پر کتابیں شریک درس و نصاب ہیں، لیکن یہ کوشش نہیں کی جاتی کہ علم و عمل کو یکجا کر دیں۔ ہمارے ہندوستانی مدارس کا تو مقصد صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ "تودۂ علم" طلبہ کے دماغ میں ٹھونس دیا جائے۔ وہ وقت دُور نہیں، جب ہماری صوبجاتی حکومتیں تعلیم کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور ہو جائیں اور پھر امریکہ، روس، جرمنی اور اٹلی کے نظریۂ تعلیم اور نظامِ تعلیم سے مفید اور مناسب اجزا جمع کر کے ایک مناسب تر اور مفید تر مرکب تیار کر لیں، لیکن ہم مدرسین اس بات کے انتظار میں معطل نہیں بیٹھ سکتے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم فرداً فرداً اپنی اپنی استعداد اور مواقع کے مطابق کچھ نہ کچھ کام شروع کر دیں، تاکہ جب اس "نشاۃِ نو" کا وقت آئے، تو ہم اس کے خیر مقدم کے لیے تیار ہوں۔

اس ضمن میں اس وقت صرف ایک تجویز پیش کی جاتی ہے اور یہ درخواست

کی جاتی ہے کہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کام شروع کر دیا جائے۔

ہر مدرس اپنے طالب علموں کے ذہن نشین کر دے کہ سماج اور ملک کی بہبود اسی میں ہے کہ "خاندان" سے انتہائی محبت کی جائے اور خاندان کے تمام افراد اور متعلقین سے وہ سلوک کیا جائے کہ ہر شخص اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اقتصادی بہتری اور فلاح حاصل کر سکے۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ کسی فرد کو خیرات دے کر سست رگ بنا دیا جائے، بلکہ یہ کہ مدد کر کے اسے کسب معاش کا اہل بنا دیا جائے۔

ہر مدرس اپنے اپنے حلقے کی پیداوار اور صنعت و حرفت کا عمیق مطالعہ کرے اور پھر کسی ایک صنعت یا حرفت کے متعلق اپنے مدرسے میں طلبہ ہی کو نہیں، بلکہ اُن کے والدین کو بھی وہ ذرائع اور وسائل بتائے، جن کی بدولت اس حلقے کی اقتصادی بہبود ہو سکے۔

تعلیم بالغاں کے متعلق ابھی تک ہندوستان میں کوئی باقاعدہ انتظام نہیں ہُوا، بلکہ جب وقت تک یہ انتظام ہو، ہم لوگ بیکار نہیں بیٹھ سکتے۔ اس لیے ہر مدرس کو انفرادی طور پر یہ انتظام کر لینا چاہیے کہ وہ ایک سال کے دوران میں کم از کم دس بالغوں کو خواندہ بنا دے گا۔

ہندوستانی زبان

قوم کی تشکیل کے چند ضروری اسباب ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی ملک کے افراد کا ہم مذہب ہونا، سیاسی اور اقتصادی مقاصد کی یک جہتی، ملک میں ایک ہی زبان کا رائج ہونا وغیرہ وغیرہ۔

ان سب اسباب کا یک جا ہونا اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ ایک ملک کے باشندے جلد از جلد ایک ہی رشتۂ قومیت میں منسلک ہو جائیں، ہندوستان میں صورتِ حالات مختلف ہے، یعنی، اگر ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ اب تمام ملک میں سیاسی اور اقتصادی مقاصد یکساں ہیں، تو بھی اس امر سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان مختلف المذاہب ہے اور یہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ پراکرت اور بھاشا کے دَور کے بعد فارسی آئی

اور ملک میں خوب رواج پا گئی۔ اگرچہ یہ رواج صرف حکمران قوم ہی تک محدود تھا۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملکی عدالتیں اور امور سلطنت سے تعلق رکھنے والے مختلف اداروں کے عمّال کے لیے اظہارِ خیالات کا ذریعہ فارسی تھا۔ دو تین صدیوں کے بعد مغلوں کے دَور میں سنسکرت، پراکرت، بھاشا، عربی اور فارسی کے میل ملاپ سے ایک نئی زبان پیدا ہو گئی، جو کچھ مدت تک تو صرف ایک نئی زبان ہی رہی، لیکن اب اُس نے ملک میں ایک اہم اور ضروری زبان کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ فوج، پولیس، عدالتوں اور اکثر دفاتر میں یہ رواج پا چکی ہے۔ اس کے پاس ایک اچھا خاصہ لٹریچر بھی ہے اور انجمنِ ترقی اُردو حیدر آباد دکن اور دیگر اداروں کی کوششوں سے فلسفہ، سائنس اور دورِ جدید کے ضروری مضامین پر کتابوں کا بھی ایک اچھا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے۔ اس زبان کی سرشت ایسی ہے کہ یہ نئی نئی ضرورتوں کے ماتحت نئے نئے الفاظ اور نئے نئے اسالیب بیان اختیار کرتی چلی جا رہی ہے۔ یہ امر ایک زبان کے زندہ ہونے اور روز بروز ترقی کرنے کا کفیل ہوتا ہے۔

ہندوستان میں وطنیّت اور آزادی کے جذبات کے ساتھ ساتھ یہ ضرورت بھی محسوس کی گئی ہے کہ تمام ملک میں حتی الامکان ایک ایسی زبان رواج پا جائے، جسے کلکتے کا بنگالی، مدراس کا مدراسی اور سندھ کا سندھی سمجھ سکے۔

اس ضرورت نے مختلف اقوام اور مذاہب کے افراد کے دلوں میں یہ خیال پیدا کر
دیا کہ اگر کوئی زبان جو اُن کی تہذیب، تمدن اور معاشرت کی آئینہ دار نہیں، رواج
پاگئی، تو اُس قوم اور مذہب کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوگا، یعنی، اگر مسلمان سے
اُردو چھوٹ گئی، تو مسلمان کی معاشرت اور تہذیب کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہوگا۔
اگر ہندو سے ہندی چھوٹ گئی، تو اُس کے دھرم اور اُس کی تہذیب کی خصوصیات
کے مٹ جانے کا اندیشہ ہوسکتا ہے، یعنی ہر اقلیت اور ہر اکثریت خائف ہے کہ
اس کی زبان اور زبان کے ساتھ ساتھ اس جماعت کی خصوصیات ایک بے رنگ
اور بے کیف قومیت میں مل جُل کر مٹ جائینگی۔ محض سیاسی نقطۂ نگاہ سے یہ بحث
نہایت دلچسپ ہے، لیکن اگر عمرانی نقطۂ نگاہ سے اس پر غور کیا جائے، تو یہ سیاسی
گرما میں اُٹھنے والا ایک بگولا ہے، جو کچھ دیر تک بدمزگی کے گرد و غبار اڑا کر فضا
میں تحلیل ہوجائیگا۔ بہرحال میرا یہ مقصد نہیں کہ میں سیاسی یا عمرانی نقطۂ نگاہ سے
اس پر ایک مفصل بحث کروں۔ میرا مدعا یہ ہے کہ مدرسوں کے لیے زبان کی ایک
حقیقت کو واضح کردوں۔

کوئی زبان کسی کانفرنس یا کمیٹی کے بنانے سے نہیں بنا کرتی۔ سماج اپنی
ضروریات کے اظہار کے لیے ایک طریقہ اختیار کرلیتی ہے، جو بتدریج نشو و نما پاجاتا
ہے اور آخر کار ایک مکمل زبان کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ جنگِ عظیم کے بعد انگریزی

زبان کی ایک تازہ لغت ان الفاظ پر مشتمل تیار کی گئی، جو دورانِ جنگ میں بتدریج انگریزی زبان میں شامل ہو گئے تھے۔ انگریزی دنیا کی ایک نہایت ہی مقتدر زبان ہے اور اس کے اقتدار کا ایک راز یہ ہے کہ ہر وقت ہاتھ پھیلائے تیار رہتی ہے کہ نئی ضروریات کے اظہار کے لیے نئے الفاظ اور نئی ترکیبیں خواہ کسی زبان ہی کی ہوں، اپنے میں ملا لے۔ ہندوستان کی مشترکہ زبان کی یہ ایک خصوصیت ہونی چاہیے کہ یہ نئی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نت نئے الفاظ اور اسالیب بیان قبول کرتی رہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی زبان میں نئے الفاظ کیوں کر شامل ہو جاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آج مہینوں کی مسافت دنوں میں طے ہوتی ہے اور مختلف اقوام کے افراد بین الاقوامی زندگی میں اس طرح شریک ہیں، جیسے پہلے کسی قصبے یا شہر کے افراد ایک دوسرے سے متعلق ہوتے تھے، اس لیے نئی ضرورتوں کے لیے نئے الفاظ کا استعمال شروع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک ضرورت موجود نہ تھی، تو اُس کے لیے کوئی لفظ بھی نہ تھا۔ جب ضرورتیں پیدا ہوئیں، تو الفاظ بھی پیدا ہو گئے۔ اسٹیشن، موٹر کار، ٹیلیفون اور سینکڑوں الفاظ انگریزی زبان سے ہندوستان کی زبانوں میں آملے اور اس طرح کہ عام آدمی کو یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ الفاظ اس کی اپنی زبان کے نہیں ہیں، البتہ جس ضرورت

کے اظہار کے لیے کسی زبان میں الفاظ موجود ہوں، اس کے لیے کسی دوسری زبان سے نیا لفظ لینا زیادتی ہے، کیونکہ اس نئی بھرتی سے زبان کے احاطۂ بیان میں کوئی ترقی نہیں ہوتی۔

مندرجۂ بالا سطور سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ کسی زبان میں مترادفات' یعنی، ہم معنی الفاظ کا اکٹھا ہونا زبان کے اصول کے خلاف ہے۔ بالعموم ہم اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ زبان میں کتنے ہی الفاظ ہم معنی ہو سکتے ہیں، مثلاً کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ عربی زبان میں اُونٹ کے لیے کئی سو الفاظ ہیں، مگر ایک عرب جانتا ہے کہ ہر لفظ ایک خاص قسم کے اُونٹ کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے اور بس۔ ایک نہایت ہی پیش پا اُفتادہ مثال اُردو زبان کی لیجیے، ہم میں سے کون ہے، جو گھوڑا، ٹٹّو اور کوتل کے الفاظ سے واقف نہیں۔ یہ سب ایک بڑی قسم، یعنی گھوڑے کے ماتحت ہیں، لیکن اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ یہ تینں مختلف قسم کے جانور ہیں۔ یا پھر گھوڑے ہی کے اقسام کو لیجیے، تو نقرہ، گرّا، سُرنگ، کمیت، ابلق، مُشکی وغیرہ وغیرہ مختلف نام ہیں، جو مختلف رنگ رُوپ کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مختصراً یہ بالکل قطعی اور واضح امر ہے کہ کسی زبان میں مترادفات کا موجود ہونا ممکن نہیں۔ میری اس گزارش کو سُن کر شاید کوئی اُردو دان صاحب فرمائیں کہ اُردو تو مخلوط النسل

زبان ہے اور اس لیے اس میں مترادفات موجود ہیں، یعنی، ماں اور ماتا، ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ یہ صحیح ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے، تو معلوم ہو جائیگا کہ اُردو میں بھی صرف چند الفاظ ایسے ہیں، جو انسان کی ابتدائی ضروریات کا اظہار کرتے ہیں اور انھیں کے مترادفات موجود ہیں۔ اُردو کو چھوڑیے، کسی اور زبان کے لفظ کو لیجیے، ماتا ٹھیٹھ ہندوستانی عورت ہے، جس کے نزدیک اُس کا بیٹا ایک مقدّس شخصیت ہے اور جس کے نزدیک بیٹے کو دیکھنے کے لیے جذباتی آنکھوں کے علاوہ اور کوئی آنکھیں موجود نہیں۔ اب لفظ 'مادر' پر غور فرمائیے، اس لفظ کی اصلیّت بالکلّیہ اسلامی ہے اور اس کا معہود ذہنی ایک ایسی شخصیت ہے، جس کے نزدیک بیٹے کی وہ اہمیت اور وقعت نہیں، جو ماتا کے نزدیک ہے۔ اب اگر کوئی ادیب، جو صحیح معنوں میں الفاظ کی سرشت اور مزاج سے واقف ہے، کہیں لفظ ماتا استعمال کرتا ہے اور کہیں مادر، تو یقین مانیے کہ اس کے ذہن میں اگرچہ ہر دو مواقع پر ایک ہی عورت ہے، لیکن اس عورت کا مزاج اور اس کی سرشت مختلف ہے۔

مزید بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں اور ہم بلا تامّل یہ مان سکتے ہیں کہ زبان میں مترادفات نہیں ہوتے۔

قومیت کے جوش نے ہمیں زبان کی حقیقت کی طرف سے اندھا کر دیا ہے

اور آج ہر طرف سے یہی آواز سُنائی دیتی ہے کہ اُردو اور ہندی قوم کے جسم پر بڑھنے والے پھوڑے ہیں اور ہندوستانی ہی ہمارے قومی دکھوں کی دوا ہے۔ ہندوستانی کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے کہ ہندی والے سنسکرت کے ثقیل الفاظ کو اس میں دخل نہ دیں اور اُردو والے عربی، فارسی کے الفاظ کے استعمال کو ترک کر دیں، یعنی حتی الامکان آسان سے آسان الفاظ استعمال کیے جائیں۔ قہر کے بدلے غصّہ، شمشیر کے بدلے تلوار، انبساط کے بدلے خوشی وغیرہ وغیرہ۔ آپ خود ہی غور فرمائیے کہ کیا یہ مترادفات ہیں اور کیا ان سے لکھنے اور بولنے کا مفہوم پوری طرح ادا ہو جاتا ہے۔ اس سے میرا یہ مقصد نہیں کہ ہم اپنی تقریر و تحریر میں نامانوس الفاظ کی بھرمار کر دیں، بلکہ میری گزارش صرف اس قدر ہے کہ مدرّسین زبان کے اسرار سے واقف ہو جائیں اور ایک کم مایہ اظہارِ بیان کی خاطر معتبر اظہارِ بیان کو قربان نہ کر دیں۔

سَنَدی زبان

کسی زبان کی تدریس کے متعلق کچھ لکھنا ایک ایسا کام ہے، جسے بیک وقت مشکل و آسان کہا جاسکتا ہے۔ ہر وہ شخص، جسے درس و تدریس سے ذرا سا بھی تعلق رہا ہے یا ہر وہ آدمی، جس نے اصولِ تعلیم پر دو چار اوندھی سیدھی کتابیں پڑھ لی ہیں، زبان کی تدریس کے مسئلے پر کچھ نہ کچھ کہنے سُننے کو تیار ہے اور پھر لطف یہ کہ وہ اس بات پر تُلا ہُوا ہے کہ اس کی بات پکّی اور اس کا قول پورا، یعنی، جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، اس درجہ صحیح اور مناسب ہے کہ اس سے انحرافِ عقل کے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے۔

ایک دوسرا فریق ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ زبان کی تدریس کے مسئلے پر کہنے سُننے کے لیے ایسی بات ہو، جسے عقل تسلیم کرے، نفسیاتی تجربے اس کے لیے

دلیلیں پیش کریں اور خود بیان کرنے والے کے مشاہدے اور تجربے اس کی سند میں پیش کیے جا سکیں۔ "رگہائے گردن بہ حجت قوی" کا اصول اس کی عدالت میں قابلِ سماعت و تسلیم نہیں۔ آپ یہ نہ سمجھیے کہ پہلا جلد باز غلطی پر ہے۔ نیت اس کی بخیر ہے، لیکن وہ ایک اصولی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ وہ یہ سمجھا ہے کہ صرف

؎ ایک مرتبہ شیخ سعدیؒ سفر کرتے ہُوے کسی بڑے شہر میں پہنچے۔ وہاں ایک وسیع شامیانے کے نیچے بڑی شان و شوکت سے ایک عدالت ہو رہی تھی معلوم ہُوا کہ شہر کے بڑے قاضی کا دربار ہے، جس میں ایک مقدمہ، جو مدت سے فیصل نہیں ہُوا، در پیش ہے۔ دور دور سے قاضی اور فقیہ وکالت کی غرض سے آئے ہیں۔ شیخ سعدی بھی اس دربار میں ایک جگہ جا بیٹھے۔ مقدمہ پیش ہُوا۔ فریقین کے وکیلوں نے بحثیں شروع کیں۔ خوب زور زور سے چیخ چیخ کر اپنی دلیلیں بیان کرنا شروع کیں، لیکن اصل بحث اور مطلب تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ وہ قانونی پیچ شیخ کی سمجھ میں آ گیا۔ شیخ نے کھڑے ہو کر مجمع کو متوجہ کرنے کے لیے کہا کہ دعوے کی دلیل اچھی ہونی چاہیے اور یہ ضروری نہیں کہ اسے چیخ کر بیان کیا جائے۔ شیخ سعدی نے اس موقع پر یہ شعر کہا، وہ یہ ہے ؎

نہ رگہائے گردن بہ حجت قوی   دلیل قوی باید و معنوی

اسی "رگہائے گردن" کی طرف اشارہ ہے۔

اصول کی واقفیت سے انسان زبان کی تدریس پر حاوی ہو سکتا ہے۔اس کے لیے غور و فکر کی ضرورت نہیں۔اس کے لیے اپنے تجربے اور مشاہدے کی پرکھ بیکار ہے۔وہ مُصِر ہے کہ اس کی متاع کسوٹی پر کسے بغیر پورے نرخ پر فروخت ہونا چاہیے۔ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ممکن ہے کہ اُس کے پیش کردہ قواعدِ تدریس کامیاب ثابت ہوں،لیکن عقل و فہم کا تقاضا ہے کہ اس گروہ سے قطع نظر کر لی جائے،کیونکہ ان کے بیشتر اصول،عربی،فارسی،سنسکرت اور اب موجودہ زمانے میں انگریزی کی تدریس کے اصول سے اخذ کیے گئے ہیں اور آج تک اُنھوں نے اس بات کو اچھی طرح نہیں سمجھا کہ 'مادری زبان' بچے کی جان کے ساتھ اُترتی ہے،دراں حالیکہ یہ دوسری زبانیں تو مادری زبان کی ابتدائی تحصیل کے بعد ہمارے علمِ السنہ میں شریک ہوتی ہیں۔ان کا نفس اور مزاج اَور ہے اور مادری زبان کا نفس اور مزاج اَور۔یہ زبانیں اُستاد کی قمچیوں کی معرفت قواعدِ صرف و نحو سے تحصیل کی جاتی رہی ہیں اور اب بھی کم و بیش ان کی تحصیل کے ذرائع یہی ہیں اور مادری زبان ماں کے دودھ کے ساتھ،ہر سانس کے ساتھ بچے کی زندگی میں شریک ہوتی جا رہی ہے۔

البتہ دوسرا گروہ،مدرّسوں،معلّموں اور اصحابِ فکر کا ہے،جنھوں نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ مادری زبان اور دیگر "السنۂ قدیمہ" کے حصول کے مقاصد

جدا جدا ہونے چاہییں اور ہیں۔ اور یہ کہ قواعدِ صرف و نحو تو ہمارے دستورِ لسانی کے اعلان ہیں۔ زبان ان کی محتاج نہیں، یہ زبان کے محتاج ہیں۔ یہ گروہ بچے کی ضروریات، زبان کی ضروریات اور تدریس کے نفسیاتی اصولوں سے واقف ہے۔ اس گروہ کو حق ہے کہ اپنے تجربے اور مشاہدے پیش کرے اور بتلائے کہ ایسی ایسی حالت میں یہ تدبیر کارگر ہو چکی ہے اور قیاس یہ کہتا ہے کہ اس صورتِ حالات میں یہ پھر کارگر ہوگی۔

ان مؤخرالذکر اصحاب کے لیے زبان کی تدریس کے متعلق کچھ کہنا واقعی ایک بے انتہا اہم کام ہے اور ایک مدرس کا فرض ہے کہ وہ مادری زبان کی تدریس کے اصولوں کے انتخاب میں ہدایت کی تلاش مندرجۂ بالا معیار کو مدِّ نظر رکھتے ہُوئے کرے اور خود بھی اسی فکر میں لگا رہے کہ میرے مشاہدے اور میرے تجربے مجھے یہ بتا رہے ہیں۔ کیا ان کا بتایا ہُوا طریق ہر معیار پر پورا اُترے گا۔ مادری زبان کی اہمیت اور اس میں بالعموم تدریس کی ضرورت پر لکھنا اور کہنا سننا تحصیلِ حاصل ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ امورِ بالا کی تحصیل کے لیے آسان سے آسان اور مفید سے مفید طریقے تلاش اور وضع کیے جائیں اور پھر ان کو عام رواج دیا جائے۔

مفکرین نے اپنی تحقیقات سے یہ بات ہمارے سامنے پیش کی ہے کہ زبان

کے حصول کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو وہ کہ جس میں بالعموم بچے کو "ارادی تفکر" کی ضرورت نہیں پڑتی، جس کا دارومدار ہمارے برجستہ اور بیساختہ اقوال پر ہے۔ ہم اوروں کو بولتے سُنتے ہیں اور خود بھی وہی بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ بچے کی ابتدائی زندگی میں مادری زبان کا استعمال یونہیں شروع ہوتا ہے، وہ اپنے گردو پیش ہر ایک شخص کو جو بولتے سُنتا ہے، خود بھی وہی بولنے لگتا ہے۔ اس کے گھر کی زبان، اس کی گلی کی زبان، اس کے گاؤں اور شہر کی زبان رفتہ رفتہ اس کی زبان ہو جاتی ہے۔ اس میں محاورہ اور تلفظ، غرضکہ زبان کا ہر شعبہ ایک مقامی رنگ میں رنگا ہوتا ہے۔ دوسرا طریقہ زبان کے حاصل کرنے کا تدریسی اور تعلیمی ہے، یعنی، زبان سیکھنے والا اس زبان کے قواعدِ صرف و نحو پر دسترس حاصل کرتا ہے۔ اس زبان کے ذخیرۂ الفاظ اور طرز بیان سے واقفیت پیدا کرتا ہے۔ پھر اس زبان کو لکھنا اور بولنا شروع کر دیتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ مادری زبان ان دونوں طریقوں، یعنی، برجستہ اور بیساختہ اقوال کے ماتحت اور تدریسی اور تعلیمی اقوال کے ماتحت حاصل ہوتی ہے اور ان ذرائع میں بچے کی عمر کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی جانی چاہیے، لیکن اس وقت میرا یہ مدّعا نہیں کہ تدریسی اصول اور ذرائع پر کچھ عرض کروں۔ میں صرف 'مادری زبان' کے مفہوم کی ضروری وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

مادری زبان سے ہمارا مفہوم کیا ہے؟ کیا یہ وہ زبان ہے، جو بغیر محنت و تکلف ہر شخص بولتا ہے اور شاید بقدرِ ضرورت لکھتا بھی ہے، یعنی جس زبان میں گفتگو اور تحریر پر کم و بیش ہر بچہ ایک حد تک حاوی ہے؟ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے، تو ظاہر ہے کہ مادری زبان کے احاطۂ اقتدار میں وسعت باقی نہیں رہیگی اور یہ صرف ایک ایسا ذریعۂ اظہار بن کر رہ جائے گی، جو شخصی اور مقامی ضروریات کے علاوہ انسانی زندگی کی پیچیدگیوں سے قطع نظر کرنے پر آمادہ ہے۔ زبان کا مقصد ہے کہ وہ انسانی خیالات کی ترجمانی کر سکے، جس میں فلسفی اپنے مشکل سے مشکل حقائق اور کاشتکار اپنی روزمرہ کی باتوں کو بیان کر سکے۔ جس میں ایک طرف تو یہ صلاحیت ہو کہ وہ سائنس اور نئے علوم کو اپنے احاطے میں جگہ دے اور دوسری طرف جس میں یہ سلیقہ ہو کہ شاعر اور ادیب اپنے جذبات کو رنگ سکے اور صرف یہی نہیں۔ اس میں ایک ایسی یکسانی پیدا ہو جائے کہ کسان کو شاعر کی زبان بیگانی اور اجنبی نہ معلوم ہو۔ مختصر یہ کہ زبان میں ہمہ گیری اور ہمہ دانی ہو اور ظاہر ہے کہ مدرس کا کام اس سندی زبان کی تدریس ہوگا۔

سندی زبان کا مسئلہ ہنگامہ خیز ہے۔ وہ دیکھیے، لکھنؤ اور دہلی والے کنوتیاں اٹھائے سن رہے ہیں۔ لکھنؤ والا کہتا ہے کہ میری زبان کھری ہے۔

دہلی والا کہتا ہے کہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے کیا حاصل ہے، تم نے جو کچھ سیکھا ہے، مجھ سے سیکھا ہے۔ اُردو کو پالا پوسا میں نے ہے۔ تم تو صرف اس کی جوانی کے شناسا ہو۔ یہ گفتگو سن کر حیدر آباد دکن اور لاہور والے بول اُٹھتے ہیں کہ موجودہ حالت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے، ہمارے حقوق آپ حضرات سے زیادہ ہیں۔ آپ ہمارے شین، قاف پر اعتراض ضرور کرتے ہیں، لیکن ہم نے اُردو کی خدمت میں کوتاہی نہیں کی اور اپنے مقدور سے زیادہ اس کی بالیدگی اور تنومندی کے فکر میں لگے رہے ہیں، انصاف یہ چاہتا ہے کہ ہماری بات سب سے اُونچی ہو اور جو ہم بولیں اور لکھیں، وہ سند سمجھا جائے، یعنی، ہماری زبان سندی زبان ہو۔ مدرّس اس چارطرفہ لاف زنی سے پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ ان مدعیوں میں سے کسے سچا جانے اور کسے جھوٹا گردانے۔ اس کے پاس ایک ترازو ہونی چاہیے کہ اس پر جنس کو تول لے اور ایک کسوٹی ہونی چاہیے، جس پر مال کو کس لے۔ یعنی، اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ سندی زبان کون سی ہے اور اس میں کیا کیا اوصاف ہونے چاہییں۔ کیا سندی زبان دلّی اور لکھنؤ کی زبان ہے، جو رواجِ پارینہ کی غلام ہے، جس میں تذکیر اور تانیث کے جھگڑے اب تک چلے آتے ہیں، جس میں ولی دکھنی اور میر تقی کی بندش اور محاورے کو آج تک قابلِ اتباع سمجھا جاتا ہے اور اگر اس کے چیرہ دست مدعیوں کی ہر بات مان لی جائے، تو

"کھجلائے ہے"، "کھڑ کائے ہے"، متروکات قرار نہیں دیے جا سکتے، جس میں متقدمین کے دَور کے بعد کسی ترقی اور اضافے کا امکان باقی نہیں سمجھا جاتا، جس میں "چہرہ" اب تک "چاند" ہے، جس میں معشوق کو دیکھنا اور ہوش و حواس کا جانا عشق و محبت کا نہیں، بلکہ شاعری کا معیار ہے؟

میرا یہ مدعا نہیں کہ ان کے جذباتِ عاشقانہ کی نوعیت بدل دی جائے، تو اُن کی زبان سندی ہو جائیگی، نہ میرا یہ مقصد ہے کہ رُوئے روشن کو چاند کے بدلے بجلی کا ہنڈا لکھیں، تو زبان ضروریاتِ زمانہ کے مطابق ترقی یافتہ ہو جائیگی۔ میرا مطلب تو صرف اس اعلان تک محدود ہے کہ زبان میں اگر قوتِ اختراع و تنوّع باقی ہے، تو سَندی زبان ہو سکتی ہے، ورنہ نہیں۔

کیا سَندی زبان کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ اور ترکیبوں کی بھرمار ہو، جو بہت حد تک اُردو کے ماخذ ہیں، جس میں خالص دُودھ "شیر بلا امتزاجِ آب" بن جائے؟ ظاہر ہے کہ ایک جیتی جاگتی اور ترقی پذیر زبان کے لیے دوسری زبانوں کے لفظوں اور ترکیبوں کا لینا اس کی زندگی کی دلیل ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کمخواب میں کمخواب کا اور ململ میں ململ کا پیوند ہی زیب دیتا ہے اور اُردو کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ اپنے اجدادِ معنوی، یعنی، عربی، فارسی اور بھاشا سے ہر طرح سے فائدہ اُٹھائے، لیکن مَیں اس

بات کے لیے تیار نہیں کہ نامانوس الفاظ اور ترکیبیں اس درجہ اور اس اندھے پن سے لی جائیں کہ زبان کی صورت ہی مسخ ہو جائے۔ کئی سال ہوئے، میرے ایک محترم دوست نے اپنی ایک غزل مجھے ارسال فرمائی، جس کے چند قافیے تپیدہ، دمیدہ، رمیدہ وغیرہ تھے۔ اس کے جواب میں میں نے شکریہ عرض کرنے کے بعد لکھا کہ یہ غزل اُردو یا فارسی یا عربی کی تو معلوم نہیں ہوتی، اگرچہ صرف بحیثیت غزل اعلیٰ پیمانے کی ہے اور مستحقِ داد۔ دوسری ڈاک سے اُنھیں دوست نے لکھ بھیجا: "آپ کی اُردو جذباتِ عالیہ کی متحمل نہیں ہو سکتی"۔ تھوڑی دیر کیلیے اس جھوٹے دعوے کو بے دلیل مان لیجیے، تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تپیدہ، دمیدہ، رمیدہ والی اُردو سندھی زبان ہو سکتی ہے۔ اس کا بے باکانہ جواب یہ ہے کہ نہیں اور ہرگز نہیں۔ رہا "جذباتِ عالیہ کا متحمل ہونا" یہ ایسا مسئلہ ہے کہ جو درحقیقت آج بے معنی ہے اور جس کا ثبوت یہ موجود ہے کہ اُردو میں، یعنی عام فہم سندھی اُردو میں طرح طرح کے علوم وفنون کے خزانے منتقل ہوتے جا رہے ہیں۔ بوجھل لغت، ثقیل الفاظ نہ تو زبان کے حسن کو بڑھاتے ہیں اور نہ معانی میں وسعت پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے سندھی زبان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ غیر کے بوجھ سے آزاد ہو، لیکن مزاج میں میل جول ہو کہ غیر زبان کے جس لفظ میں ملاپ اور محبت کی خوبو ہو، اُسے اپنا بنا لے، جو رواجِ پارینہ کی احتیاط کے

ساتھ ساتھ حسبِ ضرورت بے معنی قیود کو چھوڑنے اور توڑنے کے لیے ہر وقت آمادہ ہو، جو عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی، فرانسیسی، غرضکہ ہر زبان سے الفاظ اور ترکیبیں لینے کے لیے تیار ہو، مگر ایسے الفاظ اور ترکیبیں، جن سے اس کے بیان میں وسعت اور بلندی پیدا ہو سکے اور جس میں صلاحیت ہو کہ وہ اس سے گھل مل جائیں۔

اکثر ایک ہی لفظ مختلف باتوں کے بیان اور اظہار کے لیے موزوں ہوتا ہے، مثلاً میرا چاقو تیز ہے، وہ گھوڑا تیز رفتار ہے، اس کا مزاج تیز ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایک لفظِ 'تیز' کے کتنے مختلف معنے ہیں اور کس قدر سہل ممتنع۔ اگر اُردو میں یہ صلاحیت ہے کہ اس کے اکثر الفاظ نئے نئے معنے، جو غیر زبانوں میں مستعمل اور رائج ہیں، لے سکیں، تو آخر کیوں نہ لیں، اس سے زبان کی سندی حیثیت پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ہماری سماجی کیفیات بدل رہی ہیں۔ قبولِ عام ایک سند ہے۔ اس لیے ان ضروریات کے ماتحت اگر اُردو کے الفاظ نئے نئے معنے اختیار کر لیں، جس کے لیے متقدمین کی نظم و نثر میں سے سند نہ مل سکے، تو یہ نئے اسلوبِ بیان بھی سندی قرار دے دیے جائیں۔

فرض کیجیے کہ میر انیس یا مرزا غالب یا قریب آئیے، تو داغ یا امیر مینائی آج پیدا ہو جاتے ہیں۔ بازار میں گزرتے ہوئے ایک روزانہ اخبار خرید لیتے ہیں۔

پہلے ہی صفحے پر یہ الفاظ ان کی نظر پڑتے ہیں: "منشی دین محمد، بلدیے کی نشست کے لیے بھاٹی دروازے سے کھڑے ہونگے۔" آپ بتلائیے کہ ان امیر مینائی کے پلّے کیا پڑیگا، لیکن اس سے انکار نہیں کہ زبان اِن کی خانہ زاد چھوکری تھی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اخبار کا یہ فقرہ کسی وقت سندی زبان قرار نہیں دیا جائیگا۔ اس کے صرف یہ معنے ہیں کہ ان بزرگوں کے زمانے اور آج کی ضروریاتِ زندگی میں بہت تبدیلیاں ہو گئی ہیں اور صرف پچیس تیس ہی برس میں نئی ضروریات کے ماتحت زبان نے نئے نئے الفاظ اور پُرانے الفاظ کے نئے نئے معنے قبول کر لیے ہیں۔

اب یہ بات ظاہر ہے کہ مدرس کا مقصد ایک ایسی سندی زبان کی تدریس و تعلیم ہے، جو پارینہ روایاتِ لسانی کی حامل ہے، جو خُذ ما صَفا، دَعْ ما کَدِر پر آمادہ ہے اور جو زندگی کی گوناگوں ضروریات کی کفالت کے لیے تیار ہے، جو السنہ قدیمہ سے ایک الگ حیثیت اور شخصیت رکھتی ہے اور جس کا منشا ہے کہ اظہارِ بیان میں حتی الامکان ایک عمومیت پیدا ہو جائے، جو فلسفی، شاعر اور عام پیشہ ور کی اجنبیت کو بہت حد تک مٹا دے۔

زبان کے تدریسی تصوّرات

ہمارے مدارس میں زبان کی تدریس کے بڑے بڑے انوکھے طریقے رائج ہیں۔ اکثر و بیشتر مدرّسین کے نزدیک زبان کی تدریس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مقررہ نصاب پڑھا دیا جائے۔ مقررہ نصاب کے معنی ہیں، ایک درسی کتاب، صرف و نحو اور چند اقسام کی مضمون نگاری، مثلاً دو چار طرح کے خطوط، یا زیور پہننے کی خرابیاں، نوعمری میں شادی کر دینے کی خرابیاں، ریل کے فوائد، سلطنتِ برطانیہ کی برکتیں وغیرہ وغیرہ۔ درسی کتاب کو پڑھاتے ہُوے، مشکل الفاظ کی تشریح اور محاوروں کے معانی۔ صرف و نحو پڑھاتے ہُوے، ماضی شکیہ، استمراری، فعلِ ناقص وغیرہ وغیرہ کی تعریفیں، زبان کی تدریس کا مقصد سمجھی جاتی ہیں۔ انگریزی زبان کے مدرّس البتہ چند مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، لیکن اس کے معنی صرف اس قدر

ہیں کہ وہ زبان کی تدریس کے چند مقاصد سے آگاہ ہوتے ہیں، لیکن اس آگاہی سے ان غریبوں کی اُلجھن میں کچھ اضافہ ہی ہو جاتا ہے اور یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکتے کہ انگریزی ترجمے کی معرفت پڑھائی جائے یا براہِ راست، غرضکہ وُہ بھی لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں ایسے مدرس بھی نظر پڑتے ہیں، جو زبان کی تدریسی ماہیت اور طریقۂ تدریس کے متعلق بعض تصوّرات رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کے لسانی تصوّرات بھی بالعموم نصاب وضع کرنے والے ماہرین کے خیالات کی اتباع میں ہوتے ہیں۔ اُردو کے نصاب کی تدوین بوجوہ چند دقیانوسی تصورات کی مطابقت میں ہوئی تھی، وہ اب بھی رائج ہیں۔ یہ تصوّرات کچھ زیادہ موزوں اور مفید نہیں یا کم از کم مکمل اور مکتفی تو کسی صورت میں بھی نہیں ہیں۔ اُردو کی تدریس کی خامیاں اور کوتاہیاں دیکھ کر دل دُکھتا ہے۔ ان خامیوں اور کوتاہیوں کا سبب یہی ہے کہ مادری زبان کی تدریس میں تازہ تحقیقات اور جدید اصولوں سے کام نہیں لیا جاتا۔ اُردو کے مدرّس کو وہ عزت اور اہمیت حاصل نہیں، جو دراصل اس کا حق ہے۔ اُسے زبان کی تدریس کے لیے اس طرح تیار نہیں کیا جاتا، جس طرح ٹریننگ کالجوں میں انگریزی کے اساتذہ کو تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے اُردو صرف ایک زبان ہے، جس کا تعلق انسانی زندگی سے جو کچھ بھی ہو، اُس کی توجہ اور سمجھ سے باہر ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ بالعموم ہمارے مدرسین زبان کی

تدریس کے صحیح اور مفید تصور سے ناآشنا ہیں اور اُن کی یہ لاعلمی اتنی بڑی مشکل ہے کہ اُردو کے مدرس کی تمام سعی کو بے اثر اور بیکار بنا دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم زبان کی ماہیت پر دھیان دیں اور زبان کے تصرفات پر نظر رکھیں، تو ہمیں ایک ایسا نظریہ قائم کرنے میں آسانی ہوگی، جس کا تعلق ہماری اجتماعی زندگی سے ہوگا اور جس کی مدد سے ہم چند مفید اور کامیاب اصولِ تعلیم اور طریقۂ تدریس اخذ کر سکیں گے۔

اس سلسلے میں یہ ناگزیر ہے کہ ایک ایسے لسانی تصوّر کی تلاش کی جائے، جسے ہم اجتماعی کردار کی حیثیت میں پیش کر سکیں، لیکن اس تلاش سے قبل مَیں ان تصورات کو بھی پیش کرنا چاہتا ہوں، جو نامکمل اور غیر مکتفی ہونے کے باعث ہمارے مدرسین کو ایک غلط نہج پر چلا رہے ہیں۔ یہ تصوّرات تعداد میں تین ہیں:-

اوّل۔ زبان اظہار خیالات کا ایک آلہ ہے۔

زبان کا ہمارے افکار و خیالات سے چولی دامن کا ساتھ ہے اور نہ صرف یہ بلکہ زبان ہمارے خیالات کی ترتیب و تنظیم میں بھی ممد و معاون ہوتی ہے۔ گویا اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ ہمارے خیالات کو سلجھائے اور اُن کے اظہار کا وسیلہ بنے۔

ہماری زبان ہمارے خیالات کے ساتھ دو صورتوں میں وابستہ ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ 'لفظ' حرفوں کا خالی ڈھانچہ ہی نہیں ہوتا، بلکہ اس ڈھانچے کے اندر ایک خاص تصور موجود ہوتا ہے۔ آپ کسی کے منہ سے لفظ "گلاب" سنتے ہیں، تو اس لفظ کے سُنتے ہی آپ کو ایک خاص رنگ، ایک خاص بناوٹ اور ایک خاص خوشبو کے مجموعے کا خیال آتا ہے، یعنی، گلاب کا لفظ سن کر گلاب کے پھول کا تصوّر پیش نظر ہوتا ہے۔ اب فرض کیجیے کہ آپ کسی سے لفظ "ملاب" سُنیں، تو اس لفظ کو سُن کر کوئی تصور آپ کے ذہن میں نہ آئیگا۔ بالفاظ دیگر مقررہ صوتی اشارے آپ کے ذہن میں مقررہ تصورات کو پیش کرتے ہیں، یعنی، الفاظ اشارے ہیں، جو خیالات کے ارسال کا فرض انجام دیتے ہیں اور ہمارے مافی الضمیر کے اظہار کا وسیلہ اور ذریعہ بنتے ہیں، لیکن کبھی کبھی ہمارا مافی الضمیر اس درجہ وسیع اور اس قدر پیچیدہ ہوتا ہے کہ صرف الفاظ اس کی مفصل اور مکمل ترجمانی اور تشریح نہیں کر سکتے۔ ابرو کا ہلکے ہلکے اُوپر اُٹھنا، ہاتھ کی خفیف سی جنبش، تیوری کے بل اور ایسی بہت سی حرکات بعض اوقات معانی کا وہ دفتر پیش کر دیتی ہیں، جو الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ کون ہے، جو خندہ زیر لب کو نہیں جانتا؟ کون ہے، جو ناک بھوں چڑھانے کے معنی نہیں سمجھتا؟ کون ہے، جو تنفس کی تیزی کے پیچھے، انسانی سینے میں پوشیدہ جذبات کے سمندر میں تلاطم کے مدّوجزر کو نہیں دیکھ لیتا، لیکن ان سب کا طریقہ اظہار محدود ہے۔ جہاں تک صرف احساسات کے اظہار کا تعلق ہے،

یہ غیر لسانی حرکتیں لفظوں سے زیادہ کارآمد ہوتی ہیں، مگر جہاں مفہوم کی قطعیت اور تکمیل کا سوال در پیش ہوتا ہے، وہاں الفاظ ان حرکتوں پر فوقیت رکھتے ہیں غصہ، نفرت، خوشی اور ہیجان کے اظہار کے لیے تو انھیں حرکتوں سے کام چل جاتا ہے اور ایسا کہ کسی مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، لیکن بالعموم خیالات اور تصورات کے اظہار اور اعلان کے لیے یہ حرکتیں کام نہیں دیتیں۔ ان کے لیے ہمیں الفاظ ہی کی پناہ لینا پڑتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جن کے پاس الفاظ کا ذخیرہ زیادہ ہوگا، وہ زیادہ آسانی کے ساتھ اپنے خیالات اور تصورات کا اظہار کر سکیگا۔

زبان ایک دوسری صورت میں بھی خیالات کے ساتھ وابستہ ہے۔ آپ اگر کوئی مضمون لکھنا چاہیں یا تقریر تیار کرنا چاہیں، تو آپ اپنے خیالات کو ترتیب دیتے ہیں اور جب یہ خیالات ایک خاص نظم و ترتیب میں آچکتے ہیں، تو آپ ان خیالات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں، یعنی، الفاظ خیالات کی تخلیق اور ان کو سلجھانے میں بھی مدد دیتے ہیں اور یہی الفاظ ان خیالات کو دوسروں تک پہنچا بھی دیتے ہیں۔

زبان کی تعلیم میں نشست الفاظ کا اسلوب اور فقروں کی ترتیب سے مقالہ کی تیاری دو بڑے ہی ضروری جز ہیں، لیکن زبان کو اثر انگیز بنانا، الفاظ کو ترتیب دینے، فقرے اور پیرے وغیرہ بنانے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ ایک مقرر

اپنی تقریر بڑی محنت سے تیار کرتا ہے، دنیا جہاں کی معقول باتیں اس میں بھر دیتا ہے اور اسٹیج پر آکر پوری پوری خطیبانہ مہارت سے کہہ بھی دیتا ہے، لیکن اگر اس کی زبان بے اثر ہے، تو اُسے کامیابی حاصل نہ ہو سکیگی۔ زبان کے اچھے اور موثر ہونے کے متعلق کوئی عام یا فیصلہ کن بات نہیں کہی جا سکتی، البتہ یوں سمجھ لیجیے کہ اگر تقریر کے ذریعہ آپ کی انفرادیت کا اظہار ٹھیک ٹھیک ہو گیا، تو زبان اچھی اور موثر، ورنہ بے کیف اور بے اثر۔

طلاقت کے ساتھ ساتھ ذہانت کی بھی بڑی ضرورت ہوتی ہے، لیکن یہ ذہانت شخصی نہیں، بلکہ اجتماعی ہونی چاہیے، کیونکہ اس ذہانت کا کام دوسرے لوگوں کے خیالات سے ہم آہنگی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اگر ہم زبان کو اظہار خیالات کا آلہ بنائیں اور اس اظہار میں کسی قسم کی کمی رہ جائے، تو تقریر اس کمی کو بہت جلد ظاہر کر دیتی ہے۔ آپ جب تقریر کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، تو سامعین کی توجہ تراکیب الفاظ اور تنظیم خیالات پر ہی نہیں ہوتی، بلکہ آپ کی خطابت کے طرز اور آواز کی خوبی کو بھی پرکھا جاتا ہے۔ جسم کے انداز اور اشارات بھی مدنظر ہوتے ہیں، چہرے سے منعکس ہونے والے جذبات کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں آپ کی تقریر کی کامیابی یا ناکامی کی ذمے دار ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں، جو زبان میں اثر پیدا کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ مثالاً ذکاوتِ طبع، برجستگی،

بے تکلف اندازِ بیان، شگفتہ رُوی وغیرہم۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہُوئے ضروری ہے کہ ہم زبان سیکھنے کے لیے زبان کے مطالعہ کے علاوہ، زبان سے تعلق رکھنے والی حرکات وسکنات، موقع ومحل کا بھی مطالعہ کریں۔ زبان ایک اجتماعی چیز ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی پیچیدگیوں پر عبور حاصل کرنے کے لیے موزوں سوچ بچار کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ لوگ جو غور اور فکر کے عمل کو زبان کی بنیاد سمجھتے ہیں، اکثر مندرجہ ذیل ارکان ثلاثہ کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں:۔

ا۔ زبان کی تدریس میں صرف ونحو اہم درجہ رکھتی ہیں۔ صحیح فقرے، ہم اسی کے موضوع اصول کی مدد سے بولتے اور لکھتے ہیں۔ مثالاً جب ہم کہتے ہیں، "میں نے سات بجے سیر کو جانا ہے"۔ تو صرفی کے کان کھڑے ہوتے ہیں، وہ فوراً معترض ہوتا ہے اور یوں اصلاح کرتا ہے کہ "مجھے سات بجے سیر کو جانا ہے" یا "میں سات بجے سیر کو جاؤنگا"۔ وہ ہم سے کہتا ہے کہ مصدر سے پہلے "نے" کا آنا صرف کے اصول کی خلاف ورزی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "میں سات بجے سیر کو جاؤنگا" زیادہ مقبول ہے، لیکن بیشتر خطیب اور ادیب اپنی تقریر اور تحریر میں مصدر سے پہلے "نے" کا بے تکلّف استعمال کر دیتے ہیں۔ اگر اس "نے" کا استعمال کھٹکتا ہے، تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُردو دان جماعت اسے قبول

نہیں کرتی، تو گویا زبان کو خیالات کے اظہار کا آلہ سمجھیں، تو ہمیں صرف و نحو کی تعریفوں، ترکیبوں وغیرہم کو اہمیت دینا ہی پڑیگی۔

ب۔ زبان کی تدریس میں فقروں اور پیروں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ صرف و نحو کے پرستار مدرّس فقرے کی تعریف یوں کرتے ہیں۔ "فقرہ مجموعہ ہے چند لفظوں کا، جس سے مفہوم پورا پورا ادا ہو جائے۔" یہ حضرات فقروں اور پیروں پر غالباً اسی لیے زیادہ زور دیتے ہیں کہ وہ اپنے خیالات کو مکمل بالذّات پیمانے سمجھتے ہیں، لیکن درحقیقت قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فقرے اور پیرے ہماری زبان کے مکمل بالذات پیمانے ہیں۔ ان فقروں اور پیروں کی اہمیت سے اگر مَیں انکار کر دوں، تو ہٹ دھرمی ہوگی۔ ان سے میں خود اسی مضمون میں کام لے رہا ہوں، لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ہماری روزمرہ کی زبان عام بول چال، بحث و تمحیص اور ٹکڑوں پر مشتمل رہ گئی ہے، اس میں فقروں اور پیروں کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ رمز و کنایہ، بُڑبُڑا دینا، سر کی ہلکی سی جنبش، دبی دبی سی ہنسی، ایک لفظ یا ایک مقولہ، کوئی تشنۂ تکمیل سی ترکیب، یہ سب باتیں فقروں اور پیروں ہی کا کام دیتی ہیں۔ آپ کے احتیاط سے تیار کیے ہوئے پیرے جوں کے توں دھرے رہ جاتے ہیں، تو گویا کہا جا سکتا ہے کہ فقرے اور پیرے جو ایک مکمل خیال کو پیش کرتے ہیں، اس زبان کے مکمل بالذات پیمانے

نہیں ہوتے، وہ بے ضرورت لفاظی جو اساتذہ بے محکان استعمال کرتے ہیں، بے معنی ہو چکی ہے۔ روزمرہ کی زبان میں اب ان چیزوں کا کوئی دخل نہیں رہا۔

اچھا تو اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا ہم فقروں اور پیروں کی تدریس کو خیرباد کہدیں؟ نہیں، بلکہ چاہیے کہ ہم تحریر کو، بالخصوص تشریحی اور بیانیہ تحریر کو بہت تھوڑا وقت اور بہت کم توجہ دیں، فقروں اور پیروں کی تدریس سے بہت زیادہ سروکار نہ رکھیں۔ اس صورت میں بچے ہُوے وقت کو زبان کے اجزاے ترکیبی اور دیگر اہم لسانی اصول پر صرف کریں۔

ج ۔ وہ حضرات، جو اُردو کے نصاب کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ یہ خیالات کے اظہار میں مدد دیگا، وہ اپنی توجہ کو لفظوں کے رسمی اور منظم مطالعے میں لگائے رکھتے ہیں اور اس کے لیے دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ الفاظ کا ذخیرہ جتنا زیادہ ہوگا، خیالات کا خزانہ بھی اتنا ہی وسیع ہوگا، یعنی، اگر ہم بچوں کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کردیں گے، تو گویا ہم اظہارِ خیال کے ذریعے کو اور بڑھا دیں گے اور اس طرح سے اُن کی سوچ بچار کی قوت میں بھی اصلاح ہو جائیگی۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ذہین آدمی کے پاس الفاظ کا ذخیرہ بھی زیادہ ہوتا ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے بہتر اور موزوں الفاظ استعمال کرسکتا ہے، لیکن یہ یقین کرلینا بھی درست نہیں کہ اگر ہم طلبہ کی لسانی معلومات

میں لفظوں کی بھرمار کر دیں، تو اُن کی ذہانت بھی خود بخود بڑھ جائیگی۔ ذہانت اور ذخیرۂ الفاظ دونوں کا انحصار تجربے پر ہوتا ہے، لیکن یاد رہے کہ تجربے سے، تجربے کی وسعت مراد نہیں، بلکہ اس کی گہرائی مراد ہے اور اس سے مقصود یہ نہیں کہ ایک بچے نے تجربے سے اثر کس قدر قبول کیا، بلکہ یہ کہ اپنے تاثرات کو خوبی کے ساتھ اپنے استعمال میں لا سکتا ہے کہ نہیں۔ طلبہ کے ذخیرۂ الفاظ کو بڑھانے کی جو کوشش کی جاتی ہے اور مرادف الفاظ کی تمیز کے لیے جو محنت کی جاتی ہے، اس سے وقت بھی اکارت جاتا ہے اور سرگرمی عمل بھی۔ الفاظ کا ذخیرہ تو سُننے سنانے سے آپ ہی آپ بڑھتا جاتا ہے۔

ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ الفاظ عجیب وغریب شعبدہ بازی کا تختۂ مشق بنائے جاتے ہیں۔ ہندی کی چندی نکالی جاتی ہے، بیچارے لفظوں کے بال کی کھال کھینچی جاتی ہے، ان کو فقروں میں استعمال کرایا جاتا ہے۔ فقروں میں خالی چھوڑی ہوئی جگھوں کو مناسب الفاظ سے پورا کرانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے مدارس میں ہوتا ہے لیکن اس کا اثر سوچ بچار اور موثر طریق اظہار پر قطعاً نہیں پڑتا۔ بہتر یہ ہے کہ آپ تجربے کا ایک ایسا ماحول پیدا کر دیں، جو بات کرنے اور تاثرات کو بیان کرنے پر اُکسائے۔ البتہ اس کے بعد مناسب اور موزوں الفاظ کے انتخاب اور استعمال کی طرف بھی توجہ کرنا

ضروری ہے۔ اس صورت میں ذخیرۂ الفاظ میں آپ ہی آپ اضافہ ہوتا رہیگا۔
یہ گویا لفظوں کی مشق کا اجتماعی پہلو ہوگا، زبانی اور حفظی پہلو نہیں۔
"زبان کی تخیلی حیثیت" کے تصور پر مَیں نے بحث کی ہے۔ اس کی کمزوریوں
اور کوتاہیوں کا ذکر کیا ہے۔ مَیں ذہانت اور سوچ بچار کی قدر و قیمت سے آگاہ
ہوں۔ زبان کی تحصیل کے لیے بندھے ٹکے لسانی قوانین کو جو اہمیت حاصل ہے
مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ مَیں تو صرف اس امر کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں
کہ زبان کی تدریس میں محض لسانی اور تنظیمی پہلو پر زور دینا کافی نہیں ہے۔

(۲) زبان لٹریچر کی حیثیت سے

یہ گویا ایک تصور ہے، جس کے سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم لٹریچر
کی اصلیت اور اُس کی ماہیت، یعنی، اُس کی تعریف سے واقف ہوں۔ لٹریچر
یا ادب عالیہ کیا ہے؟ اس سوال کا مکمل یا قطعی جواب دینا ادبی تنقید سے متعلق
ہے، یہاں اس کا موقع نہیں کہ اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ کچھ لکھا جائے۔
البتہ اجمالی طور پر صرف اتنا عرض کیا جا سکتا ہے کہ ادب عالیہ، زبان کی لطیف
اور ترقی یافتہ صورت ہوتی ہے، جس کے ذریعے اس زبان کے بولنے والے مفکّر
اور ادیب اپنے بہترین خیالات کا اظہار کرتے ہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ جب بچوں
کو زبان کی تعلیم دی جائے، تو انھیں اچھے اچھے ادیبوں کی تصانیف سے بھی

روشناس کرایا جائے۔ بعض مدرسین کا خیال ہے کہ اچھی تصانیف کا پڑھ لینا ہی بچوں کے لیے کافی نہیں، بلکہ طلبہ میں خاص خاص ادبی طرز میں لکھنے کا شوق اور مستند ادیبوں کے طریقۂ تحریر کی اتباع کی خواہش بھی ضروری ہے۔ مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں۔ میرا خیال ہے کہ کامیاب انشا پردازی کے لیے کسی خاص طرز کی اتباع نہایت درجہ مضر ثابت ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ مضمون کی رعایت سے طرزِ تحریر ہلکا یا بھاری ہو جاتا ہے یا بقول اساتذۂ سلف بزم کا رنگ اَور ہے اور رزم کا ڈھنگ اَور، تاہم کامیاب انشا پردازی کے لیے ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی شخصیت اور انفرادیت کا اظہار کرے، یعنی، اپنے انفرادی جذبات، پسند اور ناپسندی کا بے کم و کاست اعلان کر سکے، لیکن جب کسی کے طرزِ بیان اور اسلوبِ بیان پر پابندیاں عائد کر دی جائینگی، تو ظاہر ہے کہ اس شخص کا طرزِ اظہار اور اسلوبِ بیان محض دوسرے کی نقالی ہو جائیگا۔

اُردو کا ادب عالیہ، اُردو زبان کو بہت موثر اور دلکش صورت میں پیش کرتا ہے، لیکن ہر ملک اور ہر زمانے کا ادب عالیہ سماج کا پابند رہا ہے۔ سماجی ذہن میں تبدیلیاں، ادب عالیہ میں تبدیلیاں پیدا کر دیتی ہیں۔ اس کی شکل وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے۔ آج سے پچاس برس پہلے کے ادب اُردو اور آج کے ادب اُردو پر نگاہِ تقابل ڈالیے، تو ان میں انتہائی درجے کا فرق نظر آئے گا۔

بہرحال یہ امر مسلمہ ہے کہ اچھا ادبی طرز اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے اتنا ہی موثر ہوتا ہے، جسقدر تشریحی، عامی، رواجی اور اشتہاری طرز اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل میں موثر ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک زندگی کے روزمرّہ کے لیے نہایت ضروری ہے۔

سب سے زیادہ عام اور سب سے زیادہ مفید طرز روزمرہ کا محاورہ ہے، جس میں عام بول چال ہوتی ہے۔ روزمرہ کی زبان ہی اصلی اور صحیح زبان ہے۔ زبان کا یہی طرز ہمیں زندگی کے بیشتر موقعوں پر اختیار کرنا چاہیے اور مدارس میں بھی اسی طرز کو رواج دینا چاہیے۔ باقی طرز منجملہ ادبی طرز کے حسب موقع سکھائے جا سکتے ہیں، لیکن یہ کوشش کرنا تو سراسر بیجا اور غلط ہے کہ موجودہ زمانے کے ادیبوں کا طرزِ نگارش، زندگی کے روزمرّہ میں استعمال کیا جائے۔ ادب عالیہ کی معرفت روزمرہ کی تدریس ناممکن ہے ؎

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

ہمارے مدارس میں، بالخصوص ان مدارس میں جہاں زبان کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ تصور یعنی "زبان بہ حیثیت لٹریچر" بہت زیادہ موثر خیال کیا جاتا ہے، لیکن اگر اس سے ادبی مذاق میں ترقی بھی ہو جائے اور قوتِ اظہار بھی بڑھ جائے، جب بھی ہم اسے کافی نہیں سمجھ سکتے۔ ایسی تدریس کا تعلق صرف ایک خاص قسم

کی زبان سے ہوتا ہے اور زبان کی وہ قسم، جو ہمارے روزمرہ میں کام آتی ہے، نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ میرا تو مشاہدہ ہے کہ زبان کی تعلیم کو لٹریچر کی تدریس پر منحصر کر دینے کا نتیجہ عموماً اچھا نہیں ہوتا۔ بیچارے طلبہ کے دماغ ناپختہ ہوتے ہی ہیں، اس پر مستزاد یہ کہ تعلیمی ماحول اور مدرس کا محدود علم رسمی ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ صحیح ادبی ذوق فنا ہو کر رہ جاتا ہے۔ زبان میں بناوٹ آجاتی ہے اور ایسا طرزِ تحریر رواج پا جاتا ہے، جس میں انفرادیت نام کو نہیں ہوتی، جس میں برجستگی کا فقدان ہوتا ہے۔ البتہ جو مرصّع ہوتا ہے، پر تکلف ہوتا ہے، رسمی بناؤ چناؤ سے آراستہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طرزِ تحریر مذاقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔

یہ تصور کہ "زبان محض لٹریچر پر منحصر ہے" بتدریج مٹنا شروع ہو گیا ہے۔ زبان لٹریچر کی رنگیں قبا اُتار رہی ہے۔ اب تحریر میں لفظوں کی بناوٹ پر نہیں، بلکہ خیال کی تخلیق پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور یہ تبدیلی حقیقت میں نیک فال ہے۔

(۳) 'زبان رواجی حیثیت میں' اس تصور کے مدعیوں کا خیال ہے کہ زبان کی رسمیں اٹل اور ناقابل تغیر ہوتی ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ والے آج تک بات بات کی سند مانگتے ہیں اور جو کچھ لسانی رواج کے خلاف ہوتا ہے، اُسے قابل پذیرائی نہیں سمجھتے، لیکن حقیقت حال ملاحظہ کیجیے، تو ظاہر ہے کہ لفظوں کے معنی بدلتے رہتے ہیں، لفظوں کے استعمال بدلتے رہتے ہیں۔ دنیا کی رسوم پر نظر ڈالیے، یہ بھی

ایک حالت پر قائم نہیں رہی۔ لباس بدلتا رہتا ہے، آداب مجلس بدلتے رہتے ہیں، معاشرت کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ ہماری زبان کا انحصار بھی رسموں پر ہے، اس لیے لسانی رسمیں بھی تبدیلی سے محفوظ نہیں رہ سکتیں۔ اگر آپ پرانے رواجوں اور پرانی رسموں کی لکیر ہی پیٹنا چاہیں، تو آپ مختار ہیں، لیکن ان کو آپ دوسروں پر عائد نہیں کر سکتے۔ زبان کی رواجی حیثیت پر ایمان رکھنے والے زبان کے ارتقا کے قائل نہیں۔ زبان انھیں ایک منجمد، نہ بدلنے والی معیاری شے نظر آتی ہے اور اگر ان حضرات سے کوئی یہ کہدے کہ زبان تو ایک جیتی جاگتی چیز ہے۔ ارتقا اس کی فطرت میں شامل ہے، نشو ونما اس کے خمیر میں داخل ہے، تو وہ ان حضرات کے نزدیک گردن زدنی اور کشتنی قرار دیا جائیگا۔

زبان کے اس رواجی تصور کے حامی حضرات زبان کی تدریس کرتے ہوئے طلبہ کے شخصی رجحانات اور ذہنی خصوصیات کو بالکلیہ نظر انداز کر دیتے ہیں، حالانکہ مشاہدہ گواہ ہے کہ ایک طالب علم قواعد وضوابط، رسم و رواج سے باغی اور برگشتہ ہوتا ہے، دوسرا ان کا پابند اور پیرو کار۔ کوئی فطری سرد مہری کے باعث سیلِ زندگی میں تنکے کی طرح بہنا پسند کرتا ہے اور کوئی گرمیِ شوق سے کامرانی کی راہ پر چلنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ جب انسانی طبائع اس درجہ مختلف ہوں، تو ظاہر ہے کہ زبان کی مشق کرتے ہوئے، جو شخصیت کے اظہار کا واحد طریقہ ہے،

ان سب افراد میں ہم آہنگی اور یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کرنا سراسر مضر ثابت ہوگا۔

(۴) زبان ایک اجتماعی کردار کی حیثیت میں

میں نے زبان کے ان تین تصورات پر، جو مادری زبان کی تدریس میں بہت موثر خیال کیے جاتے ہیں، ایک مختصر سا تبصرہ پیش کرتے ہوئے، ان کے غیر مکتفی ہونے کے وجوہ بیان کیے ہیں۔ انھیں تین تصورات کی روشنی میں ان قواعد وضوابط کا محاسبہ بھی کیا ہے، جو زبان کی تدریس کے لیے وضع کیے گئے ہیں، لیکن یہ قاعدے ہماری زبان کی تمام تدریسی ضروریات کے کفیل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے مناسب ہے کہ ان تصورات کے ساتھ ایک اور تصور یعنی "زبان اجتماعی کردار کی حیثیت میں" بھی شامل کر لیا جائے۔ ذیل میں اس تصوّر کا تجزیہ اور اس کے متعلق چند توضیحات پیش کی جاتی ہیں:۔

۱۔ زبان ایک وسیلہ ہے، اجتماعی کردار کا۔ جس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچائے۔

۲۔ بولنا ایک جسمانی کردار ہے، اس کے ساتھ سارے جسم کی حیات و حرکت کا تعلق ہوتا ہے۔ صرف ہماری زبان ہی نہیں بولتی، بلکہ سر سے پاؤں تک رگ رگ مصروف گویائی ہوتی ہے۔ بولنے کے لیے تحریک دلانے والی بھی

وہی باتیں ہوتی ہیں، جو عام طور سے دوسرے جسمانی تاثرات کو حرکت میں لاتی ہیں۔

لکھنا بھی ایک جسمانی کردار ہے، جس میں ہاتھ اور بازو زیادہ ضروری فرائض انجام دیتے ہیں اور آنکھیں امدادی طور سے کام کرتی ہیں۔

۳۔ زبان کی وساطت سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں، اس لیے یہ اجتماعی اور مجلسی چیز ہے۔ بول چال کا کردار لکھنے کے کردار سے کہیں زیادہ اجتماعی ہوتا ہے۔ جب ہمارے ساتھ ایک یا ایک سے زیادہ اشخاص ہوں، تو ان سے بات چیت کرتے ہوئے کسی بات کی ہم تائید کرتے ہیں اور کسی کی تردید۔ یہی اجتماعی وصف لکھائی میں بھی ہوتا ہے۔ آپ اپنے دل کی بات کاغذ پر لکھ دیتے ہیں، لیکن اس کا مقصد صرف لکھ دینے سے پورا نہیں ہوتا، اس کا مقصد جب پورا ہوگا کہ آپ کے لکھے ہُوئے لفظوں کو کوئی پڑھ بھی لے۔

۴۔ زبان کے مقصد دو ہیں، اظہارِ شخصی اور دوسروں سے تبادلۂ خیالات۔ اظہارِ شخصی بھی دوسروں ہی کی موجودگی میں ہوتا ہے اس لیئے دوسروں کے ساتھ بات چیت کا فعل بہت زیادہ اہمیّت رکھتا ہے۔ البتہ اپنے دل سے باتیں کرنا، روزنامچہ لکھنا، نظم یا افسانہ لکھنا ایسے افعال جن کا تعلق صرف لذتِ اظہار اور ذوقِ بیان سے ہے مستثنیات میں داخل ہیں۔ ان کا تعلق کسی دوسرے کے ساتھ نہیں ہوتا، لیکن ایسی باتوں کو ہمارے روزمرہ کے ساتھ کوئی زیادہ تعلق

نہیں ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان کا اجتماعی پہلو، ذاتی پہلو کی نسبت زیادہ اہم ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ بات میں اثر زیادہ ہو، تو ذاتی پہلو کی نسبت اجتماعی پہلو کی تربیت پر زیادہ زور دینا چاہیے۔

۵۔ چونکہ زبان اظہار شخصی کا وسیلہ ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ہر فرد کی زبان اس کی شخصیت کا اہم جزو اور صحیح مرقع ہو اور لازمی ہے کہ اس کے عام کردار کے مطابق، یعنی اس کی زندگی کے عام افعال سے ہم آہنگ ہو۔ کسی کی گفتگو اور تحریر منطقیانہ ہوتی ہے، کسی کی پُر جوش۔ کوئی عامی ہوتا ہے، کوئی پُر گو۔ کوئی ٹھس ہوتا ہے اور کوئی تخیلی۔ کسی میں تصنّع ہوتا ہے اور کوئی صاف اور برجستہ۔ غرضکہ یہ سب کچھ انفرادی کردار کا مظاہرہ ہے، جو زبان کے لباس میں جلوہ نما ہوتا ہے۔

۶۔ زبان کے خاص مقاصد یہ ہیں کہ اس کے ذریعے سماجی تعلقات قائم ہو جائیں۔ ایک دوسرے کی اصلاح کی جا سکے۔ خاص خاص نتیجے ترتیب دیے جا سکیں۔ کسی کو راغب یا قائل کیا جا سکے۔ کیفیت بیان کی جا سکے۔ خبریں مشتہر کی جا سکیں۔ باہمی مدد کے کاروبار جاری ہو سکیں۔

جب زبان تحریر کے ذریعے سے پیش کی جاتی ہے، تو اس سے مدعا یہ ہوتا ہے کہ کوئی خاص بات مستقبل کے لیے محفوظ ہو جائے، جو اشخاص کچھ فاصلے

پر ہوں، ان سے تبادلۂ خیالات ہو سکے۔ زیادہ لوگوں تک اپنی بات پہنچائی جا سکے۔ عام زبان کی اصلاح کی جا سکے۔ غرض کہ تحریر کے مقاصد بھی زیادہ تر سماجی اور اجتماعی ہیں۔

۷۔ معیاری زبان وہ ہے، جو صاف اور پسندیدہ ہو اور عام لوگ اُسے سمجھ سکیں۔ اگر اس معیاری زبان میں کوئی تفریق یا تصریف کی جائے، تو اس طرح کہ اس کی ترجمانی حیثیت میں نقص نہ آئے۔ اس کی سلاست اور تاثیر میں کوئی فرق نہ آئے۔

زندگی گوناگوں ہے۔ مختلف ماحول میں مختلف زبان کا رواج پانا ناگزیر ہے۔ سماج کی خاص خاص ضرورتوں کے ماتحت زبان میں بھی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ تاجر کی زبان اور ہے، طبیب کی کچھ اور۔ وکیل کی زبان کچھ اور ہے، اہلِ حرفہ کی کچھ اور۔ بہر حال اس کے متعلق بنیادی اصول یہ ہے کہ زبان صاف ہو، دل پسند ہو اور عام فہم ہو۔

۸۔ وہ زبان جو صحیح تو ہو، لیکن بے ڈھنگی اور بے تکی ہو اور ہماری ضروریات کے لیے کافی بھی نہ ہو، قبول عام کی سند حاصل نہیں کر سکتی۔ اسی طرح وہ زبان جو درستی کے معیار پر تو پوری اُترے، لیکن اس میں تکلف اور تصنع ہو معیوب خیال کی جاتی ہے۔

ان تمام گزارشات سے جو پیش کی جا چکی ہیں، یہ واضح ہو گیا ہے کہ ہمارے مدارس میں زبان کی تعلیم ادھوری سی ہوتی ہے۔ ذیل میں اس کی وجوہ عرض کی جاتی ہیں:-

ا۔ زبان کے تخیلی پہلو پر زور دیا جاتا ہے، جس کے باعث اس کا کرداری پہلو نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

ب۔ صاف، پسندیدہ اور عام فہم بول چال کی جگہ رسمی تحریر اور ادب عالیہ نے لے لی ہے۔

ج۔ "تحریر" کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ "بولنے" کو کافی وقت نہیں دیا جاتا۔

د۔ محاورے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ صرف نحو کی اہمیتوں میں مبالغہ کیا جاتا ہے۔

ہ۔ زبان کی تعلیم کا زیادہ تر انحصار کتابوں کے مطالعے پر ہے، لیکن جو عناصر زبان کو زیادہ موثر بنا سکتے ہیں، ان پر توجہ نہیں دی جاتی۔

یہ چند توضیحات جن کا ذکر کیا گیا ہے، زبان کو اجتماعی کردار کے طور پر پیش کرنے کا ایک خاکہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ زبان کے تین تصورات بھی جن کا ذکر ابتدا میں کیا جا چکا ہے، اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں، لیکن ان میں خامیاں

اور کوتاہیاں ہیں۔ اس لیے اگر ان میں سے صرف کسی ایک کو زبان کی تدریس کی بنیاد قرار دیا جائے، تو وہ ناکافی ثابت ہوگا۔ اگر زبان ہی لوگوں کو تعلیم دینے کا واحد ذریعہ ہے، تو ہمیں چاہیے کہ بچوں کو زندگی کے اجتماعی طور وطریق سکھائیں، انھیں موثر زبان کے اجتماعی کردار کی طرف توجہ دلائیں اور زبان کے مبادیات، نیز مصطلحات پر اقتدار و اختیار پانے کے مواقع بہم پہنچائیں۔

"زبان ایک اجتماعی کردار ہے" صرف یہی ایک مفروضہ ہے، جو ہماری تمام ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔

تعلیمِ جدید کے تقاضے

گزشتہ چند سال سے یورپ اور امریکہ میں "تعلیمِ جدید" کے متعلق بہت کچھ کہا اور لکھا جا رہا ہے۔ ہندوستان بھی کم و بیش ڈیڑھ صدی سے یورپ کے خوانِ نعمت کا ریزہ چیں ہے اور اس لیے یہاں بھی تعلیمِ جدید کے متعلق ماہرینِ تعلیم طرح طرح کی باتیں کہہ رہے ہیں۔ ماہرینِ تعلیم سے قطع نظر کر لیجیے، ہندوستان کے سیاسی لیڈر مسٹر گاندھی کی سنیے، اُنھوں نے پروفیسر ڈیوی کے اصول کی اتباع میں واردھا نظامِ تعلیم کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی کمیٹی کی معرفت پیش کیا ہے۔ ہر صوبے میں حکومت نے مروجہ اصول اور نظامِ تعلیم کی جانچ پڑتال کے لیے کمیٹیاں بنا کر اپنی صوبائی خودمختاری کا اعلان کیا ہے۔ غرضکہ یورپ، امریکہ اور چشم بد دُور ہندوستان میں بھی تعلیمِ جدید کا خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔

یہ تعلیمِ جدید کیا ہے؟

انسان کی عادت ہے کہ متضاد خیالات اور مختلف عقائد رکھے اور اُن کی تبلیغ کرے۔ اہم اصول اور جزوی باتیں، غرضکہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اس اختلاف پسندی سے خالی نہیں۔ کوئی شہنشاہیت کا مداح ہے اور کوئی جمہوریت کے گیت گاتا ہے۔ کوئی سرمایہ داری میں دنیا کی فلاح کے خواب دیکھتا ہے اور کوئی اشتراکیت میں۔ کوئی مذہب کا دلدادہ ہے، کوئی مذہب سے بیزار۔ لیکن ہر ایک اپنے خیال اور عقیدے کی اہمیت پر مصر ہے۔ یہ تفرقہ اور اختلاف تعلیم کے میدان میں بھی موجود ہے۔ یہاں بھی مروجہ طریقۂ تعلیم کے حامی ایک طرف ہیں اور تعلیمِ جدید کے مبلّغ دوسری طرف۔ مروجہ تعلیم کے پیرو کار کہتے ہیں کہ تعلیم کا مقصد داخلی اور شخصی خصائص کی تربیت ہے۔ دنیا والوں نے ہزاروں سالوں کی پیہم کوشش سے علم کا خزانہ بھر دیا ہے۔ ہمارا کام ہے کہ ان اطلاعات سے طلبہ کو مالا مال کر دیں۔ گزری ہوئی نسلوں نے بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ آنے والی نسلوں میں بھی بڑے بڑے کام کرنے کی استعداد پیدا کر دیں اور بڑے بڑے کاموں کی تعریف یہ ہے کہ ہم انھیں بڑا کہیں۔ ہمارا قائم کردہ اخلاق کا معیار موجود ہے۔ مدرسے کو چاہیے کہ اسی "اخلاق" کو رواج دے۔ ایک اخلاق پر ہی کیا منحصر ہے، جو چیزیں صدیوں کی کوشش کے بعد حاصل ہوئی ہیں، وہ سب کی سب ایسی ہیں کہ

آنے والی نسلیں اُنھیں حاصل کریں۔ قصہ مختصر مروجہ معیارِ زندگی پر پورے اُترنے کے قابل ہو جائیں۔ آج جو بچہ ہے، وہ کل بڑا ہو جائیگا۔ آج جو علم حاصل کو رہا ہے، کل وہ اس علم کو دوسروں تک پہنچائیگا۔ آج جو کچھ بھی زندگانی سے حاصل ہو، کل وہ دوسروں کی زندگی کے لیے بہم پہنچائیگا، یعنی، مدرسہ ایک کارخانہ ہے، جہاں آج ایک مشین تیار کی جارہی ہے تاکہ وہ مشین کل کی دنیا میں مفید ثابت ہو۔

جب تعلیم اور تدریس کا یہ طور ہو، تو ظاہر ہے کہ ان سے بہرہ ور ہونے کے لیے متعلمین میں کچھ صفات خاص ہونی چاہییں، جو اجمالاً یہ ہو سکتی ہیں۔ طالب علم کی طبیعت اور اُس کے مزاج میں ہمواری ہو۔ وہ جس کام پر لگایا جائے، اس پر لگ جائے۔ اُسے جو بات بتائی جائے اُسے مان لے۔ اُس کے آگے جو اصول بھی پیش کیے جائیں، ان پر آمنّا و صدّقنا کہے۔ پھر اس کے علاوہ طالب علم میں بہرہ مند ہونے کی استعداد بھی موجود ہو۔ اطاعت اس کی سرشت میں ہو۔ ان سب کے لیے ذریعہ کتابیں ہیں۔ کتابیں علم کا خزینہ ہیں۔ طالب علم اُنھیں پڑھے اور جذب کرلے۔ جس حد تک متعلم یہ سب خود کر سکتا ہے، کرے اور جو کچھ وہ از خود حاصل نہیں کر سکتا، اُسے مدرس سے حاصل کرے، یعنی، مدرّس علم اور کتابوں کا کارندہ ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ سلیم الطبع اور اطاعت شعار نوجوانوں کے اندر کتابوں میں لکھے ہوئے علم کو بھر دے۔ مختصراً مدرسے کی حیثیت یہ ہے کہ وہ ہمارے گھروں

اور دوسرے معاشرتی اور تمدنی اداروں سے مختلف ہے۔ وہاں عالمِ بالا سے نازل ہونے والے ضبط وانتظام کا رواج ہے۔ وہاں کتابوں سے حاصل ہونے والا علم متاعِ حیات ہے۔ وہاں چیزوں کو رٹ لینے کا نام تحصیلِ علم ہے۔ وہاں دُور از کار اور غیر متعلق اطلاعات استعدادِ زندگی کے سفر کے لیے زادِ راہ بنا کر پیش کی جاتی ہیں۔ استقلال یا بہ الفاظ دیگر جمود سے مدرسے کی بنیادیں محکم ہیں۔

تعلیم جدید، کہنگی اور جمود پر خندہ زن ہے۔ دنیا بدل رہی ہے۔ قدرت کے کارخانے میں کسی شے کو ثبات نہیں۔ اس لیے تعلیم بھی ایسی ہونی چاہیے، جو اس تغیر پسند دنیا کے ساتھ ساتھ قدم اُٹھا رہی ہو۔ علم بنفسِ خود کوئی اہم اور وقیع چیز نہیں، یہ صرف ذریعہ ہے، زندگی کو کامیاب بنانے کا۔ اس لیے تعلیم جدید کی نگاہ علم یا علم کے خزانوں، یعنی، کتابوں پر نہیں۔ اس کی نگاہ انسانی زندگی پر ہے اور انسانی زندگی اس جماعت کی نہیں، جو آج جوان ہے، بلکہ اس جماعت کی جو کل جوان ہوگی۔ اب رہا مدرّس، جو کتابی علم کو پیش کرنے کا ذمے دار ہے، اس کی حیثیت بھی بدل جاتی ہے۔ وہ کتابی علم کو صرف زندگی کے تجربوں میں پیش کرنے کا مجاز رہ جاتا ہے۔ اس کا قائم کردہ انتظام بھی محض قید ہے اور بے گناہ کو قیدی بنانے کا اور قید رکھنے کا کسی کو بھی حق حاصل نہیں۔

ظاہر ہے کہ مروجہ تعلیم اور تعلیم جدید کے اصول اور نظام میں بہت فرق ہے

اور یہ ممکن نہیں کہ دونوں بیک وقت ایک ہی جگہ قائم اور جاری رہ سکیں، اس لیے
ماہرِ تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ اس فرق کی نوعیت معلوم کرے اور اس تجزیہ کے
بعد سیدھے اور سچے اصول کا اعلان کر دے۔ ایسی صورت میں بالعموم یہ ہوا کرتا ہے
کہ متضاد اصولوں کے اجزا میں سے کچھ اُدھر سے کچھ اِدھر سے لے کر ایک نیا راستہ
بنا لیتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے ایک کمزور اور بیکار اصولِ تعلیم
رواج پا جائیگا۔ اگر یہ اصلاح ممکن ہوتی، تو اس قدر بنیادی اختلافات رونما ہی
نہ ہوتے۔ آئیے ان اختلافات میں سے چند اہم اختلافات کو فرداً فرداً جانچیں۔

مدرسے کا ماحول

ہر شخص جانتا ہے کہ ایسی جگہ جہاں بہت سے بچے اکھٹے ہوں، وہاں ایک
ضبط اور انتظام کی ضرورت ہے۔ یہ ضبط اور انتظام مدرسہ کے توانین کی پابندی
سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے کہ سزا اور ایک حد تک
استبداد مدرسہ میں رائج ہو۔ میں خود بھی ضبط اور انتظام کا نہایت ہی حامی ہوں،
لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ ضبط و انتظام مدرسے کا قائم کیا ہُوا نہ ہو، یہ عالم بالا
سے نازل نہ ہوا ہو، بلکہ یہ بچوں کا خود قائم کردہ ہو۔ اُن کی اپنی دنیا کا پیدا کیا ہوا
ہوا ہو۔ مثالاً یوں ملاحظہ فرمائیے۔ تفریح کی چھٹی ہوتی ہے۔ بچے جماعتوں کے
کمروں سے نکل نکل کر بھاگتے ہیں اور میدان میں پہنچ کر فٹ بال کھیلنا شروع

کر دیتے ہیں۔ وہاں اُستاد کا حکم اور استبداد قائم نہیں۔ کھیلتے کھیلتے ایک بچّہ فٹ بال کو ہاتھ میں لے کر بھاگتا ہے۔ موافق اور مخالف فریق دونوں یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ قانون کی خلاف ورزی ہوئی۔ فرد کے قصور کی سزا تمام جماعت برداشت کرنے کو تیار ہو جاتی ہے، یعنی، ایک قانون، جس کو رائج کرنے کے لیے اُستاد موجود نہیں، بچے خود رائج کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ایک کھیل کو اختیار کر لینے کے ساتھ ساتھ اس کے قانون اور اس کے متعلق پابندیاں بھی اختیار کر لی گئی ہیں۔ اگر یہ پابندیاں نہیں مانی جاتیں، تو کھیل بھی نہیں ہو سکتا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر بچے کسی چیز کو اختیار کر لیں، تو اُس کی ذمے داریوں کو بھی پیشِ نظر رکھیں گے، یعنی، بچوں کی اپنی بنائی ہوئی "سماج" قوانین کو اس لیے تسلیم کر لیتی ہے کہ وہ قوانین عالمِ بالا سے نازل نہیں ہُوے۔ مدرسے کے ضبط و انتظام میں بھی یہی بچوں کی سماج کار آمد اور مفید ہو سکتی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ خارجی ضبط کے بدلے وُہ ضبط بروے کار آتا ہے، جو بچوں کی سرشت اور اُن کی جبلّت میں مضمر ہے اور یہی ضبط مدرسے کے ہر انتظام کا کفیل ہو سکتا ہے؟

کتابیں

آپ نے جو مضامین مدرسے اور کالج میں پڑھے تھے، اُن میں سے کون کون سے آج آپ کی زندگی میں کار آمد ثابت ہو رہے ہیں۔ آپ کا وسیلہ معاش خواہ کچھ ہی

کیوں نہ ہو، لیکن اس سے آپ کو انکار نہیں ہو سکتا کہ نہایت محنت سے حاصل کیا ہوا کتابی علم آج آپ کے لیے کم و بیش بیکار ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں ڈگری کی بدولت آج ملازم ہوں اور اپنی معاش کماتا ہوں۔ بیشک آپ کی ایم، اے کی ڈگری آپ کی خوش قسمتی سے اس وقت بازار معاش میں فروخت ہو سکی تھی، لیکن اس وقت بھی بہت سے ایسے تھے، جن کی ڈگری کے گاہک پیدا نہ ہو سکے تھے یا اگر گاہک ملے تھے، تو انھوں نے سودا بہت سستا کیا تھا، لیکن یہ مان لینے کے بعد بھی میرا سوال اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ وہ علم جو آپ نے حاصل کیا تھا، وہ نام نہاد لازوال ودیعت جو آپ نے جمع کی تھی، اس سے آپ کیا فائدہ اٹھا رہے ہیں؟

میرا یہ مطلب نہیں کہ کتابیں جلا دی جائیں۔ اسلاف کے علم سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ وہ علم تو آئندہ حاصل ہونے والے علم کے لیے نہایت ضروری ہے۔ دی روز کے بغیر امروز ممکن نہیں اور امروز کے بغیر فردا ذہن میں نہیں آسکتا۔ میں یہ سب کچھ تسلیم کرتا ہوں، مگر میری گزارش تو یہ ہے کہ بچے کی زندگی سے غیر متعلق، بچے کی خصوصیات اور خواہشات سے ناآشنا علم کام کی چیز نہیں۔ تعلیم کے ابتدائی مدارج بچے کے تجرباتِ زندگی پر منحصر ہونے چاہییں۔ کتابیں اس زمانے کے لیے اٹھا رکھیے۔ جب بچے کے تجارب زندگی اتنے وسیع ہو جائیں کہ عام زندگی

میں اور اُن میں تفریق باقی نہ رہے۔

اُستاد

کھیل کے میدان اور فٹ بال کا میں ذکر کر چکا ہوں کھیل کی بے قاعدگیوں کا معلوم کرنے والا ایک 'ریفری' ہوتا ہے۔ اُستاد بھی ایک ریفری ہے، جو بچوں کے مسلمہ اصول زندگی کی بے قاعدگیوں کا اعلان کرنے پر مامور ہے۔ اس کے زیادہ قوی ہاتھ بچوں کی مدد کے لیے ہر وقت موجود ہیں۔ وہ عالم بالا کا نمائندہ نہیں۔ وہ بچّوں کی زندگی کا اہم جز ہے، جو حسب ضرورت اور حسب موقع مفید ثابت ہوتا ہے۔

یہ سب کیونکر ہو؟ یہ سب معمولی اصلاح سے نہیں ہو سکتا۔ تعلیم جدید کے یہ اصول کوئی حل پیش نہیں کرتے۔ یہ تو صرف اہم مسائل پیش کرتے ہیں۔ ان مسائل کا حل کرنا اور ان گتھیوں کا سلجھانا سماج کا کام ہے۔ سماج میں سب سے اہم ہماری حکومتیں ہیں، جو ایسے اُستاد پیدا کرنے کا انتظام کرینگی، جو ان اصولوں پر کاربند ہو سکیں۔ وہ اُستاد نئی ذہنیت کے لوگ ہونگے۔ اُن کے مدرسے نئے ماحول سے لبریز ہونگے۔ غرضکہ ہر چیز موجودہ سے مختلف ہو گی۔ البتہ بچے یہی ہونگے اور انشاءاللہ ان کا مستقبل زیادہ شاندار کامیاب اور خوش و خرّم ہو گا۔

تعلیم میں استبداد

انفرادی غیر ذمّے داری جماعت میں ہمیشہ اس طرح اثر کر جاتی ہے کہ ملّت غیر ذمے دار بن جاتی ہے۔ اکثر ملّت کے اربابِ حل وعقد کی غیر ذمّے داری بتدریج افراد پر اثر ڈالتی ہے۔ بہرحال غیر ذمّے داری خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، سماج کی زندگی کو نقصان پہنچانے کا باعث ہو جاتی ہے۔ ایک ملک دوسرے ملک سے، ایک حکومت دوسری حکومت سے، ایک ادارہ دوسرے ادارے سے اور ایک فرد دوسرے فرد سے تاثرات قبول کرتا ہے۔ یورپ کی طوائف الملوکی کا اثر تمام دنیا میں رونما ہو رہا ہے اور ہندوستان کی سماج بھی روز بروز نئے نئے اثرات قبول کر رہی ہے۔ اس وقت سیاسی اور اقتصادی تاثرات کی توضیح مدِ نظر نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ ان تاثرات میں سے دو یعنی 'استبداد' اور 'آزادی' کو مدّ نظر رکھتے ہوئے

اپنے مدارس کے متعلق کچھ عرض کیا جائے۔

استبداد ہر طرح اور ہر صورت میں مذموم ہے۔ آزادی ہر طرح اور ہر صورت میں قابلِ ستائش ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ ہم اپنے مدارس سے استبداد کا اخراج اور ان میں آزادی کا رواج ضروری سمجھیں۔ اس لیے ان دو لفظوں، یعنی 'استبداد' اور 'آزادی' کا صحیح مفہوم واضح ہو جانا ضروری ہے۔

استبداد کے معنی ہیں، کسی جائز مطالبے کو جبریہ طور پر دبا دینا اور آزادی کے معنی ہیں، ہر جائز مطالبے کو تسلیم کرنا۔

آئیے دیکھیں کہ ہندوستانی مدارس میں استبداد کس حد تک موجود ہے اور آزادی کس حد تک۔

مدرسے کے دو اہم اجزاء مدرس اور طلبہ ہیں۔ فرداً فرداً لیکن نہایت اختصار کے ساتھ کوشش کی جائیگی کہ ہم اُن کے حالات کا محاسبہ کریں۔

مدرس بالعموم ہیڈ ماسٹر کے احکام کی تعمیل کرتا ہے، جو جماعت اور مضمون اُسے دیا جاتا ہے، اُسے پڑھاتا ہے۔ جو قوانین مدرسے میں رائج ہوتے ہیں، اُن کی پابندی کرتا ہے۔ ہیڈ ماسٹر انسپکٹر کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔ مدرسے کے نصاب، کتابوں کے انتخاب، مضامین کی تدریس اور چھوٹے چھوٹے شعبوں کے انتظام میں انسپکٹر کے احکام کے خلاف کوئی طریقِ کار اختیار کرنے کا مجاز نہیں، لیکن انسپکٹر بھی

سررشتۂ تعلیم کے قوانین کی پابندی کے باعث اسی درجہ محتاج ہے، جیسا کہ ہیڈ ماسٹر یا سررشتۂ تعلیم خود، حکومت کی پالیسی کے پابند ہیں۔ یعنی، ابتدا سے انتہا تک ایک مستبد قانون ہے، جس کی پابندی ہر فرد پر لازم ہے۔ ہر نظام کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ہم آہنگی ہو، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ امرِ واقعہ ہے کہ اکثر و بیشتر ایک نظام اپنے کارکنوں کو سست اور اپاہج بنا دیتا ہے یا بالفاظِ دیگر یوں سمجھیے کہ آزادی کو سلب کر لیتا ہے۔ میرا اس سے یہ مطلب نہیں کہ آزادی اور غیر ذمے داری کو ہم معنی قرار دوں، لیکن مَیں یہ اعلان کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ ہر شخص جو کسی اصول کے ماتحت جزوی باتوں کو نظر انداز کر دے، وہ ذمّے دار نہیں۔ اگر ایک ہیڈ ماسٹر چند خاص کتابیں اپنے مدرسے میں رائج کرنا چاہتا ہے، جو سررشتۂ تعلیم کی طرف سے منظور نہیں ہو چکیں، لیکن جو طلبہ کی تعلیم و تربیت اور تشکیلِ سیرت، مروّجہ کتابوں سے بہتر کر سکتی ہیں، تو اُسے اختیار ہونا چاہیے کہ وُہ اُنھیں رائج کر دے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں، جن کے سبب سے ہمارے مدرّس پابند ہیں اور اس لیے اپنے مدرسوں میں جائز اصلاح کرنے سے قاصر ہیں۔

اس مستبد ماحول کا یہ اثر ہوتا ہے کہ مدرسین بھی غیر ارادی طور پر اپنے طرزِ عمل میں مستبد ہو جاتے ہیں۔

اب طلبہ کو دیکھیے، پہلے دن سے بچے کے ماں باپ اس کی زندگی کو "یہ کرو، یہ مت کرو" کا محتاج بنا دیتے ہیں۔ بچہ روتا ہے، تو ماں اس سے رونے کی وجہ دریافت نہیں کرتی، بلکہ اُسے دودھ دے کر خاموش کر دیتی ہے۔ یہ پہلا سبق ہوتا ہے، جو بچے کو ضد کی ترغیب دلاتا ہے۔ کچھ بڑا ہو کر جب یہ بچہ ضدی بن جاتا ہے، تو ماں اور باپ ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ سے کام لیتے ہیں، یعنی ایک مرض کا علاج اس سے زیادہ مہلک مرض میں مبتلا کر دینے سے کیا جاتا ہے۔ مدرسے میں داخل ہونے سے پہلے، اکثر بچے ماں باپ کے استبداد کا نشانہ بن چکتے ہیں اور مدرسے میں آ کر مستبد ماحول میں کام کرنے والے اُستادوں کے زیر سایہ مزید استبداد کے تختۂ مشق بنتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ایسے طلبہ جب کبھی آزادی پائیں گے، تو آزادی کے صحیح استعمال سے ناواقف ہونے کے باعث، اس آزادی کا ناجائز استعمال کرینگے، یعنی، وہ ایک حد تک آزادی اور غیر ذمے داری میں تمیز اور تفریق نہ کر سکیں گے۔ اُن میں بھلے اور بُرے، صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی صلاحیت بہت کم ہو گی۔ اُن کی قوتِ ارادی بہت حد تک کمزور ہو چکی ہو گی۔ ان میں عزتِ نفس اور بہادری کم، چاپلوسی اور ظلم کوشی زیادہ جلوہ گر ہو جائیگی۔

یہ بچے بڑے ہو کر، قوم کا بوجھ کس طرح اپنے کندھوں پر سنبھال سکیں گے اور کیا ہم مدرسین آنے والی نسل کی کوتاہیوں کے ذمے دار نہ ٹھیرائے جائینگے۔ بیشک

ہم قصوروار ہونگے، اگر دیکھتے بھالتے اور جانتے بوجھتے ہم اس امر کی انتہائی کوشش نہ کریں گے کہ ہمارے آج کے شاگرد، جو کل کے کارزارِ حیات کے جانباز سپاہی ہیں، ان عیوب سے پاک رہ سکیں۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما ——————

امریکہ اور دیگر متمدن ممالک نے اکثر جگہ ایسے مدارس کھولے ہیں، جہاں بچے کم ازکم دن کے بارہ گھنٹے موجود رہتے ہیں، یعنی ماں باپ کے استبداد کا بڑی حد تک خاتمہ کر دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ خود ایک ایسے انتظام اور دستور کے پابند ہو گئے ہیں، جس میں استبداد کو دخل نہیں۔ ہماری نگاہوں میں گھر کا مفہوم کچھ اور ہے اور مدرسے کا مفہوم کچھ اور۔ کتاب کچھ اور ہے، کھیل کچھ اَور۔ ان مدارس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ مدرسہ اور گھر ایک ہو جائے۔ سبق اور کھیل کا فرق مٹ جائے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ بچے کی زندگی سے استبداد حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے لیے یہ مواقع اور اسباب مہیّا نہیں، لیکن یہ ہر وقت ممکن ہے کہ ہم اپنا ذاتی اور شخصی طرزِ عمل بدل دیں اور انتہائی کوشش کریں کہ ہمارے مدرسے جیسے کچھ بھی ہوں، ہم ان میں سے استبداد اُٹھا دیں اور ایسا ماحول پیدا کریں، جس میں پلنے بڑھنے والی نسلیں ہمارے لیے باعثِ فخر و مباہات ہوں۔

آپ کو اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد ہوگا اور یہ بھی یاد ہوگا کہ چند اُستادوں

کے سبق میں آپ کا دل زیادہ لگتا تھا اور بعض کے سبق ایک مصیبت بن جاتے تھے۔ آج بھی مدرّسین میں یہ اقسام موجود ہیں اور گمان غالب یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ ایسے اُستاد ہمیشہ موجود رہیں گے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ آپ کہیں گے کہ طلبہ کی اُفتادِ طبیعت اس کی ذمے دار ہے اور بس، لیکن درحقیقت آپ کے اس جواب ہی میں اصلی راز مضمر ہے۔ کیا مدرّسین کا یہ فرض نہیں کہ طلبہ کی اُفتادِ طبیعت کا مطالعہ کریں۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم فطرتِ انسانی کے چند اہم حقائق کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں اور ان حقائق کو پیشِ نظر رکھنا ہی تعلیمِ جدید کا اولین مقصد ہے۔

آپ پانچویں جماعت کو ہندوستان کا جغرافیہ پڑھاتے ہوئے ایک خاص طریقے پر نظر رکھتے ہیں، لیکن دسویں جماعت کو پڑھاتے ہوئے، اس طریقے میں حد درجہ تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔ آخر یہ کیوں؟ صرف اسی لیے کہ پانچویں اور دسویں جماعت کے طلبہ کے فہم و ادراک میں بہت کچھ فرق ہے۔ یہی حال اور مضامین کی تدریس کا بھی ہے، یعنی، موقع اور محل کے مطابق تبدیلی ناگزیر ہے۔ اب اس سے متعلق ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ آیا ہمارا مقصد طلبہ کی تربیت ہے یا طلبہ کو مضامین پڑھانا مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ مقصود طلبہ کی تربیت ہے نہ کہ صرف مضامین کی تعلیم۔ ہماری تعلیمی اور تدریسی کوششوں میں اہمیت اور اوّلیت کا حق طلبہ کو حاصل ہے، نہ کہ مضامین کو۔ اس راز کا سمجھ لینا اور اُسے سمجھ کر مناسب

طریقے پر طلبہ کی شخصیت کی تربیت کرنا تعلیمِ جدید کا زرّین اصول ہے۔

ہمارے مدرّس بدقسمتی سے امتحانات کے بھوتوں سے اس درجہ ڈرے رہتے ہیں کہ طالب علم کی شخصیت کو علم کے لباس اور زیور سے آراستہ کرنے کی کوششوں میں اس بات کا بالکل خیال نہیں کرتے کہ جس جسم کو آراستہ کیا جا رہا ہے، اب زندہ بھی ہے یا دماغی طور پر مر چکا۔ تعلیمِ جدید کا مقصد یہ ہے کہ لباس، بے جان جسم کی آرائش نہ بنے، بلکہ ایک تنومند اور قوی پیکر کے حسن کی افزائش کا باعث ہو، اس لیے یہ ضروری ہے کہ طلبہ کی شخصی خصوصیات معلوم کی جائیں اور اُن کی تربیت بوجوہ احسن کی جائے۔

ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے، فطرت کی طرف سے چند عطیات زادِ راہ کی صورت میں لے کر آتا ہے۔ تعمیر اس کی سرشت میں اسی طرح مضمر ہے، جیسے سورج میں گرمی اور تابانی۔ ہمیں چاہیے کہ اس زندگی کے سفر میں زادِ راہ کے استعمال کی استعداد اپنے طلبہ میں پیدا کر دیں۔ تعلیم و تدریس زندگی کا جُز ہے۔ یہ زندگی سے کوئی مختلف شے نہیں۔ وہ قوتِ تعمیر، جو ہر بچے میں موجود ہے اور جس کے مظاہرے کو ہم اپنی نادانی کے باعث شرارت پر محمول کرتے ہیں، ایسی نعمت ہے، جس کا استعمال بچے کے مشاغل علمی میں ایک نشاط پیدا کر سکتا ہے۔ اس قوتِ تعمیر کا آزادانہ ظاہر کرنا ہر بچے کا حق ہے اور ہم مدرسین کا فرض ہے کہ بچوں کو زیادہ سے زیادہ موقع اس

بات کا دیں کہ وہ اس عطیۂ فطرت سے فیضیاب ہو سکیں۔

ذرا اپنی اور اپنے حلقۂ احباب کی زندگی پر نظر ڈالیے۔ اپنے شہر اور اپنے ملک کی حالت کا محاسبہ کیجیے۔ اس دنیا کا جس میں ہم رہتے ہیں۔ اس کی خود غرضیوں کا، اس کی بے دینیوں کا، اس کی نا اتفاقیوں کا، غریبوں کو پائمال کرنے کی کوششوں کا، غرضکہ اس کی ناداریوں، عریانیوں اور مصیبتوں کا مطالعہ کیجیے، تو آپ پر روشن ہو جائیگا کہ اطمینان اور فراغ کم و بیش ہر جگہ مفقود ہیں۔ اس کی وجوہ ارباب فہم خواہ کچھ ہی بیان کریں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ موجودہ دستورِ تعلیم دنیا کے ہر حصّے میں "خوشی" کے حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ یہ غالباً نہایت کامیابی سے زر و سیم کے انبار فراہم کرنا سکھا دیتا ہے، لیکن اس زر و سیم سے "خوشی" حاصل کرنے کے طریقے سکھانے سے قاصر ہے۔ زیادہ سے زیادہ حقیقی خوشی کے بدلے محض وقتی قہقہہ لگانا سکھا دیتا ہے۔ یہ رُوح کے بدلے جسم کو ایک عارضی آسائش بہم پہنچا دیتا ہے۔ تعلیمِ جدید اس تباہ کاری کو نیست و نابود کرنے کا ذریعہ ہو سکتی ہے، بشرط یہ ہے کہ ہم مدرسین یہ فیصلہ کرلیں کہ ہماری تمامتر کوششیں اس بات پر صرف ہو جائیں گی کہ آنے والی نسلوں کے ہر فرد کو اپنی شخصیت کی تربیت کے مواقع حاصل ہو جائیں اور ہر فرد اپنی زندگی سے دنیا کی خوشی میں اضافہ کر سکے۔

جذبۂ تخلیق

کائنات کی بقا کا دار و مدار ارتقا پر ہے۔ ہر آنے والی نسل اپنے اسلاف سے مشاہدے اور تجربے کے خزانے حاصل کرتی ہے اور ان میں بقدرِ حیثیت اضافہ کر کے اپنے بعد آنے والی نسل کے سپرد کر دیتی ہے۔ دنیا میں بھی تسلسل آفرینش سے قائم ہے اور جب تک دنیا موجود ہے، یہ تسلسلِ ارتقا قائم رہے گا۔ ہر قوم اس کوشش میں منہمک ہے کہ نسلِ انسانی کی خامیاں اور کمزوریاں دُور ہوتی چلی جائیں اور خوبیاں ترقی کرتی جائیں۔ آج سے دو ہزار برس پہلے انسانی زندگی کے اسالیب سیدھے سادے تھے، کیونکہ علم انسانی بھی محدود تھا۔ رفتہ رفتہ علم کا ذخیرہ جمع ہوتا گیا۔ ہر نسلِ انسانی اپنے سے پہلی نسل کے مشاہدوں اور تجربوں سے مالا مال ہوتی گئی اور یوں زندگی میں تنوع، تمامیت اور ہمہ گیری پیدا ہوتی چلی گئی۔

افراد اپنے علم سے سماج کی قوت بڑھاتے گئے۔ سماج کے اقتدار میں استواری پیدا کرتے گئے اور سماج بھی ان افراد کی حفاظت اور پذیرائی میں ہر طرح کوشاں رہی، یعنی، انفرادی تخلیق سماج کی بالیدگی کا باعث ہوتی چلی گئی اور سماج اس کے صلے میں افراد کو تخلیق، کے زیادہ سے زیادہ اور اچھے سے اچھے مواقع پیش کرتی رہی۔ یہ تخلیق چند افراد تک محدود نہیں ہوتی۔ البتہ اس میں کمی زیادتی ضرور ہوتی ہے۔ قدرت کا یہ عطیہ عام ہے۔ خالق حقیقی نے ہر فردِ بشر کو نہ صرف قوتِ تخلیق عطا فرمائی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جذبۂ تخلیق بھی عنایت کیا ہے۔ اگرچہ اکثر مواقع زندگی ہم میں سے بیشتر افراد کے اس جذبۂ تخلیق کو بروئے کار آنے کی مہلت نہیں دیتے۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی ذی شعور انسان اس سے معرّا ہے۔ اس جذبۂ تخلیق کی نشو و نما اور تربیت کے وجوہ ہوتے ہیں۔ سپاہی بے دریغ دشمنوں کی خندقوں پر حملہ کر کے جان دے دیتا ہے تاکہ اس کے گھر بار آل اولاد کی عزت و ناموس کی حفاظت ہو سکے۔ جرنیل لطائف الحیل سے دشمن کو فتح حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔ سائنس دان آلاتِ حرب کی جہاں سوزی کی قوت کو مہلک سے مہلک تر بنانے میں مصروف رہتا ہے اور یہ سب اس لیے کہ اس کی قوتِ تخلیق سپاہی کی جان فروشی اور جرنیل کی دماغ سوزی کی مددگار بن کر اس کی قوم کی حفاظت کی ضامن بن سکے، یعنی، قوتِ تخلیق کے بروئے کار آنے کا ایک سبب

بقائے حیات ہے۔

بقائے حیات کے بعد حیات کو تنومند بنانے کے لیے مختلف اسباب حیات کی فراہمی ضروری ہے۔جلب منفعت ایسا جذبہ ہے، جو انسانی قوت تخلیق کو اکثر و بیشتر کارفرمائی پر مجبور کر دیتا ہے۔میری ضروریات کی کفیل میری اپنی کوشش اور قوتِ بازو ہی ہو سکتی ہیں اور اس لیے مَیں ہمیشہ مصروف تخلیق ہوں کہ اس زندگی کی جدوجہد میں پورا اُتر سکوں۔خواہ مَیں شعر کہوں یا تصاویر بناؤں، جرنیل کی طرح جنگ کے نقشے بناؤں اور بگاڑوں یا سائنسدان کی طرح نئی سے نئی ایجادات پیش کروں۔بہرصورت تخلیق میری زندگی کی ضامن ہے اور تخلیق ہی میری زندگی کا مشغلہ ہے، چونکہ یہی میری زندگی کی مزد ہے اور یہی انعام۔

جذبۂ تخلیق کے بروئے کار آنے کا ایک اور باعث بھی ہوا کرتا ہے اور وہ ہمارے نزدیک اس جذبے کا بہترین مظاہرہ ہے، یعنی مَیں 'تخلیق' میں نہ تو بقائے حیات کے لیے مصروف ہوں، نہ جلب منفعت کے لیے، بلکہ اس لیے کہ میرا ہر مظاہرۂ تخلیق میرے لیے مسرّت اور انبساط کا باعث ہے۔تخلیقِ محض ہی میرا مدّعا ہے اور یہ تخلیق ہی اس کا انعام۔

جذبۂ تخلیق کے ضمنی اسباب بھی ہو سکتے ہیں، لیکن دراصل مذکورۂ بالا وجوہ ہی تخلیق کے ہر پہلو پر حاوی ہیں۔یوں تو ہر نیا ماحول جذبۂ تخلیق کی کارفرمائی کے لیے

ایک نیا سبب پیش کر سکتا ہے۔

یہ قوتِ تخلیق اور جذبۂ تخلیق محکوم اقوام کے مقابلے میں حکمران اور آزاد اقوام میں بہت زیادہ ہوتا ہے اور جب اس قوت اور جذبے کی کارفرمائی میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے، تو سماج میں ایک خاص تعطل اور جمود کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ تاریخ عالم اس بات کی شاہد ہے کہ ہر قوم نے اپنے تنزل اور انحطاط کے دور میں فنونِ لطیفہ میں ہمیشہ بے انتہا ترقی کی ہے۔ جذبۂ تخلیق ضرور کارفرما ہوتا ہے، لیکن اس کی صورت صرف یہ رہ جاتی ہے کہ وہ شاعری، موسیقی، مصوری اور اسی نوع کے دیگر فنون کے ذریعے اپنا اظہار کرتا ہے، اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ قوتِ تخلیق اور جذبۂ تخلیق کا مظاہرہ اس قسم کا نہ ہو، جو سماج کو سُست رگ بنا دے، بلکہ اس کی نوعیت یہ ہو کہ وہ سماج کے قوٰی کو تنومندی اور بالیدگی بخشے۔

متذکرۂ بالا بحث سے مندرجۂ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:۔

ا۔ قدرتِ تخلیق اور جذبۂ تخلیق ہر فردِ بشر میں موجود ہوتا ہے۔

ب۔ ارتقا خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی قوتِ تخلیق اور جذبۂ تخلیق کا مظاہرہ ہے۔

ج۔ افراد میں قوتِ تخلیق کا بروئے کار آنا انفرادی اور سماجی زندگی کی بالیدگی کا ضامن ہے اور اس کے مظاہرے کے لیے ضروری ہے کہ سماج افراد کی بقائے حیات، جلبِ منفعت اور آسودگیٔ نفس کے لیے مناسب ترین ماحول

مہیا کرے۔

د۔ سماج صرف اس جذبۂ تخلیق کی پذیرائی کرے، جو اس کی بقائے حیات، جلبِ منفعت اور آسودگیٔ نفس کے لیے مفید ترین ہو۔

اس تفصیل کے اجمال کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدرسین کے لیے ان اسباب و علل سے آگاہی کیونکر مفید ہو سکتی ہے، یعنی، کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے طلبہ میں جذبۂ تخلیق کی تشکیل اور تربیت کریں اور اگر ایسا کرنا چاہیں، تو اس کے لیے کیا ذرائع اختیار کرنے چاہییں۔

پہلا سوال یعنی کیا طلبہ میں جذبۂ تخلیق کی تشکیل اور تربیت ضروری ہے، کسی جواب کا محتاج نہیں۔ قدرت نے ہمیں آنکھیں اس لیے دی ہیں کہ ہم دیکھ سکیں اور دیکھیں۔ کان اس لیے دیے ہیں کہ سُن سکیں اور سُنیں۔ اسی طرح قوائے حسّی کا مقصد و منشا یہ ہے کہ محسوسات کی دنیا کا ادراک حاصل کر سکیں اور کریں۔ جذبۂ تخلیق سب قوائے حسّی کے ادراکِ تام کا نتیجہ ہے۔ اپنے ماحول سے ہم آہنگی اور بہتر ماحول کی تلاش اور تخلیق انسان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس لیے یہ ظاہر ہے کہ بحیثیت مدرسین ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے طلبہ میں جذبۂ تخلیق کی بہترین تشکیل اور تربیت کریں۔

دوسرا سوال یعنی، اس تشکیل اور تربیت کے لیے کیا کیا ذرائع اور کیا کیا وسائل اختیار کیے جائیں۔ ایک نہایت دقیق اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس کے متعلق کسی قسم کا

دستور العمل پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مختلف ماحول میں مختلف صورتیں اختیار کریگا۔ ایک دیہاتی مدرسے کے مدرسین کے ذرائع ایک شہری مدرس کے ذرائع سے مختلف ہونگے۔ البتہ چند اصول پیش کیے جاتے ہیں، جو ایک حد تک مدرسین کی رہبری کر سکتے ہیں:۔

۱۔ قوتِ تخلیق کے بروئے کار آنے کے لیے ایسے ماحول کی ضرورت ہے، جس میں آزادی، انبساط، سکون اور مظاہر فطرت سے دوچار ہونے کے مواقع طلبہ کو زیادہ سے زیادہ میسّر ہوں۔

۲۔ مدرسین اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں اور ان کا عملی ثبوت دیں کہ ان کا فرض صرف تدریس مضامین ہی نہیں، بلکہ اُن کا فرض طلبہ کی تعلیم ہے۔ اسباق اس طرح پیش کیے جائیں کہ وہ طلبہ کی زندگی سے متعلق ہوں اور ان کے اقدارِ حیات کی تشکیل کریں۔ تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، حفظانِ صحت کے اُصول، زبان غرضکہ ہر مضمون طلبہ کے لیے جیتی جاگتی ضرورت بن جائے۔

۳۔ طلبہ میں تنقید اور تبصرے کی صلاحیت پیدا کی جائے، مدرّس اپنی رائے اور اپنے عقائد کی پیروی پر مجبور نہ کریں۔

۴۔ طلبہ کی تخلیقی کوششوں کو انھیں کے معیار سے جانچیں اپنی تنقید کو تعمیری بنائیں تاکہ طلبہ کی تخلیقی اُمنگوں میں اضافہ ہو نہ کہ تخریبی خواہشوں میں، جو ہمیشہ سدِّراہ ہوتی ہیں۔

چون وچرا

ارسطو یونانی تہذیب اور علم کا بہترین نمونہ ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یونان
اس دور میں انتہائے کمال تک نہیں پہنچا، لیکن اس یونانی تہذیب کا غور و فکر
صرف منطقی دلیلوں تک محدود تھا۔ تجربے اور مشاہدے کے ذریعہ علم انسانی کی جانچ
اور پرکھ نہ کی جاتی تھی۔ علم طبیعیات کے ایک عام مسئلے کو لیجیے اور سُنیئے کہ ارسطو کی
منطق بھی تجربے اور مشاہدے کے بغیر کس قدر ناقص تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بلندی سے
پھینکے جانے پر بھاری چیز ہلکی چیز کے مقابلے میں جلد پہنچے گی، یعنی آپ اپنے مکان
کی چھت پر چڑھ جائیے۔ ایک پانچ سیر کا پتھر لیجیے اور ایک سیر بھر کا۔ دونوں کو
ایک ہی وقت میں زمین پر پھینکیے، تو پانچ سیر وزنی پتھر زمین پر پہلے گریگا۔ دنیا نے
ارسطو کے اس طبیعیاتی دعوے کو منطق کی کسوٹی پر پرکھا۔ ریاضی کا اربعہ اور تناسب لگایا

اور تسلیم کر لیا۔ اُنیس سو سال تک لوگ اس بات کو سچ مانتے رہے، لیکن سولھویں صدی، یعنی ۱۵۹۰ء میں اٹلی کے ایک ریاضی دان نے اس بات کی تردید کی۔ علما کو دعوت دی۔ ایک مینار پر چڑھ گیا۔ وہاں سے دو پتھر، جن میں ایک پانچ سیر کا تھا اور دوسرا ایک سیر کا۔ ایک ہی وقت زمین پر پھینکے اور یہ ثابت کر دیا کہ دونوں خواہ ان کا وزن مختلف ہی کیوں نہ ہو، ایک ہی وقت میں گرینگے۔ دنیا نے اس معاملے کو زیادہ اہمیت نہ دی، لیکن غور فرمائیے، تو اس ایک واقعے نے دنیا کی صورت بدل دی۔ ہمارے شعور و فراست کو یہ معلوم ہو گیا کہ صرف منطق کی زبانی دلیلیں "حقیقت اور سچ" کے دریافت کے لیے کافی نہیں، بلکہ ہر بیان کی پرکھ کے لیے تجربہ یا مشاہدہ ضروری ہے، یعنی، علم انسانی میں تحقیق اور تلاش کی ضرورت پیدا کر دی اور تحقیق و تلاش کا انحصار دلیل کے ساتھ ساتھ مشاہدے اور تجربے پر رکھ دیا۔ یہ تحقیق و تلاش موجودہ علم انسانی اور سائنس کا بنیادی پتھر ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج کسی قسم کا استبداد آنے والی نسلوں کو منظور نہیں۔ وہ ہر چیز میں "کیوں" اور "کس طرح" کو ضروری سمجھتی ہیں۔ البتّہ مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں کہ اکثر اوقات یہ جذبہ تحقیق غیر ذمے دار ہو جاتا ہے۔ اس غیر ذمے داری کو گستاخی اور بغاوت سمجھنا درست نہیں۔ پُرانے لوگوں کو یہ چاہیے کہ اس جذبے کو غیر ذمے دار نہ ہونے دیں۔ گستاخی اور بغاوت خود بخود کم ہو جائے گی اور ہمارے نوجوانوں کی عام زندگی،

اُن کے رسم و رواج، اُن کے اطوار حتیٰ کہ اُن کا ہر سماجی فعل مفید سے مفید تر بن جائے گا۔

اس تحقیق و تلاش، اس چون و چرا کے علاوہ ایک دوسرا عنصر نوعِ انسانی کے دماغ اور غور و فکر کی تشکیل میں کار فرما ہے۔ مشین کی ایجاد نے انسانی محنت کی تکلیفوں کو بہت کچھ کم کر دیا ہے۔ موجودہ دور، مشینوں اور کارخانوں کا دور ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان پر اپنے گرد و پیش کا بہت اثر پڑتا ہے۔ پہلے انسان مجبور تھا۔ اُس کی نگاہوں میں ہر وہ قوت جو جبر کر سکتی تھی، دیوتا بن جاتی تھی۔ توہمات کا انبار لگتا جا رہا تھا۔ مثلاً بجلی کو لیجیے، یہ صرف ہمارے خرمنوں کو جلا دیتی تھی۔ ہم پر اور ہمارے جانوروں پر گر کر خاک سیاہ کر دیتی تھی۔ اب یہ بجلی ہماری غلام ہے۔ ہمارے گھروں کو منور کرتی ہے۔ ہماری کلیں چلاتی ہے۔ ہم حاکم ہیں یہ محکوم۔ ہم اس سے ڈرتے نہیں، بلکہ اس سے خدمت لیتے ہیں۔ اسی طرح زندگی کے ہر شعبے میں وہ چیزیں، جن سے ہم ڈرتے تھے، اب ہماری مطیع ہیں، یعنی، قیاسی اور وہمی طور پر نہیں، بلکہ تجربے اور مشاہدے سے ہم ہر چیز کی پرکھ کرتے ہیں۔ اس کا ایک ظاہر نتیجہ یہ ہے کہ ہم ہر چیز پر چون و چرا کرتے ہیں اور جب چون و چرا دماغ کی سرشت اور عادت میں داخل ہو جائے، تو ظاہر ہے کہ سماج کے افعال اور سماج کے طور طریقوں پر بھی نکتہ چینی ہو۔ اس نکتہ چینی کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہر ایماندار

آدمی اپنے فعل کو اپنے قول کے مطابق بنا ڈالے۔ غور و فکر اور پرکھ کا نتیجہ اگر سچائی پر مبنی ہے، تو ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں سرزد ہونے والے افعال مذموم اور بُرے نہیں ہو سکتے اور کوئی چیز صرف اس لیے تنقید اور نکتہ چینی سے نہیں بچ سکتی کہ ایک صدی پہلے وہ قابلِ اعتبار تھی۔

اس زمانے میں مشین کے استعمال سے سماج پر اور بہت سے اثرات بھی پڑے ہیں۔ ایک اور مثال لیجیے۔ پہلے ہر گاؤں اور قصبہ بجائے خود ایک مکمل آبادی ہوتی تھی، جو اپنی ضروریات کی کم و بیش خود کفیل ہو جاتی تھی۔ جولاہا کپڑا بنتا تھا۔ موچی جوتا بناتا تھا۔ کسان جنس پیدا کرتا تھا۔ غرضکہ ہر ضرورت گاؤں کی گاؤں ہی میں پوری ہو جاتی تھی۔ دولتمندوں اور رئیسوں کی سکونت اگر شہروں میں ہوتی تھی، تو شہر ان کی ضروریاتِ زندگی، حتیٰ کہ اسبابِ عیش کی فراہمی کے لیے بھی کافی تھے۔ اب ہندوستان کی روئی گاؤں گاؤں کھنچکر سیکڑوں میل دور شہروں میں جاتی ہے، وہاں کاتی جاتی ہے۔ ہزاروں میل دور جہازوں کے ذریعہ غیر ممالک میں جاتی ہے، وہاں کپڑا بنتا ہے۔ پھر ہزاروں میل دُور جہازوں اور ریل کے ذریعے وہ کپڑا جاتا ہے اور بکتا ہے۔ گاؤں والا شہری پر اور شہری گاؤں والے پر انحصار رکھتا ہے۔ ریل، جہاز اور ہوائی جہاز نے فاصلے کم کر دیے ہیں۔ مدّت سفر گھٹا دی ہے۔ مہینوں کی راہ گھنٹوں کی رہ گئی ہے۔ تار برقی سے پلوں میں

اِدھر کی بات اُدھر پہنچ جاتی ہے۔ اس سب کا نتیجہ ظاہر ہے۔ گاؤں اور خاندان کے بندھن پہلے کی طرح مضبوط نہیں رہے۔ انسان کا تعلق انسان سے ہوگیا ہے۔ فرد اور اس کی شخصیت کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ جماعت اور سماج کا اقتدار بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں فرد کا تعلق اب سماج سے وہ ہے، جو پہلے خاندان سے تھا۔ بیگانگی کم اور یگانگت زیادہ ہوتی چلی جا رہی ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ تمام دنیا ایک خاندان نہ ہو جائیگی۔

یہ درست ہے کہ سماج کا نظام مکمل نہیں۔ تجارتی عناد، قومی رنجشیں، نسل و رنگ کا امتیاز ابھی باقی ہے۔ یہ فساد کا باعث بھی ہوتا ہے۔ اس سے بے انتہا تباہ کار جنگ کا بھی خوف لگا رہتا ہے، لیکن یہ بات تو پانچ آدمیوں کے کنبے میں موجود تھی۔ خاندانوں کی رنجشیں، قبیلوں کی رقابتیں پہلے بھی موجود تھیں اور اب بھی ہیں۔ پھر اگر قوموں میں یہ رنجشیں اور بدگمانیاں موجود ہیں، تو کچھ عجیب نہیں۔ تعجب یہ ہے کہ اس قدر کم ہیں اور زیادہ نہیں۔

اس تحقیق و تلاش اور چون و چرا کا ایک اور مظاہرہ بھی دیکھ لیجیے۔ مختصراً میں اسے جمہوریت کہوں گا۔ ایک زمانہ تھا کہ بادشاہ کا بیٹا بادشاہ ہوتا تھا۔ اس کا اقتدار اس کی شخصیت میں خواہ وہ کتنی ہی ناکارہ کیوں نہ ہو، مضمر ہوتا تھا۔ اب سماج خود بادشاہ ہے اور اپنی ضرورت کے مطابق کبھی اور کہیں کہیں کسی بادشاہ کی اولاد

کو نمائش کے لیے بادشاہ مان لیتی ہے اور اکثر جگہ اُسے تخت سے ہٹا دیتی ہے۔ اس کا تاج چھین لیتی ہے اور بادشاہت کی نمائشی ضرورت کو بھی نہیں مانتی۔ جنگِ عظیم کے بعد جمہوریں ایک زلزلہ آیا۔ بڑے بڑے تخت اور تاج اس زلزلے میں گر گئے۔ ان تختوں پر بیٹھنے والے اور ان تاجوں کے پہننے والے اپنے تاج وتخت کے ساتھ نیست و نابود ہو گئے۔ سماج کا یہ اعلانِ بادشاہی افراد کی متفقہ رائے کا نتیجہ تھا۔ اب یہی افراد کی متفقہ رائے استبداد کی بیخ کنی پر آمادہ ہے۔ خود اپنے پرانے رسم و رواج اور اُس کے نظام کو حسبِ ضرورت بدل دینا چاہتی ہے۔

مختصراً یوں سمجھیے، اوّل آج ہم کسی چیز کو تجربہ اور مشاہدہ کیے بغیر منظور کرنے کو تیار نہیں۔ غور و فکر اور چون وچرا سماج کا شیوہ ہو گیا ہے۔ رسم و رواج کی قدامت ان کی خوبی کی دلیل نہیں مانی جا سکتی۔ دُوم سائنس نے مشین کی ایجاد اور مشین نے ہمیں ان چیزوں پر اقتدار بخش دیا، جن سے ہم پہلے ڈرا کرتے تھے اور جن کی ہم پوجا کیا کرتے تھے۔ اس لیے ہم میں ایک احساسِ قوت پیدا ہو گیا ہے، جو مذہب کو توہمات سے پاک کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ سوُم بنی نوع انسان میں تعلقات باہمی بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ نام نہاد بزرگی اور برتری کا استبداد ممکن نہیں۔ اب جمہوریت کا دور دورہ ہے۔ اس لیے پُرانے رسم و رواج بھی تنقید اور نکتہ چینی سے نہیں بچ سکتے۔

ان تین اثرات کا نتیجہ ہے کہ موجودہ نسل ہر چیز پر ایمانداری سے معترض ہو اور حسبِ ضرورت پرانے رسم و رواج میں تبدیلیاں پیدا کر دے۔ دوسری طرف پرانے دور کے اشخاص اپنے زمانے کی تعریف و توصیف کرنے سے باز نہیں رہ سکتے اور گئے گزرے زمانے کا نوحہ کرتے رہتے ہیں۔ ہر اُٹھتے ہوئے قدم پر اعتراض کرتے ہیں، لیکن اس لیے نہیں کہ تجربہ و مشاہدہ نئی چیزوں کے خلاف ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ نئی چیزیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دونوں میں اختلاف ہے۔

البتہ یہ امر واقع ہے کہ زندگی ایک مسلسل جاری رہنے والا دریا ہے، جس کا مخرج اور منبع معلوم نہیں۔ چیزیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں اور شاید بقول علامہ اقبال

مغاں ز دانہ انگور آب مے سازند
ستارہ مے شکنند آفتاب مے سازند

تعلیمی فضا اور ٹریننگ کالج

یہ حقیقت مسلّمہ ہے کہ عصرِ حاضر کی تعلیم سماجی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتی اس ناکامی اور محرومی کی واضح اور روشن مثالیں ہمارے دیہاتی مدارس ہیں۔ اگر ہم ان مدارس پر چھچلتی سی نظر ڈالیں، تو واضح ہوجائیگا کہ تعلیم کے متعلق ہمارے نظریے اور ہمارے عمل میں بیّن تفاوت ہے۔ نیز یہ کہ ایسا تعلیمی جمود طاری ہے، جو مدارس کی پستی کا موجب ہے۔ اکثر و بیشتر مدارس ایسے ہیں، جن کی تعلیم طلبہ کے دماغوں میں تخلیق کا مادہ پیدا نہیں کرسکتی اور یہی چیز مقصدِ تعلیم کی تکمیل میں روک ہے۔ یہ بات تسلیم کرلی گئی ہے کہ دیہاتی مدارس کی تعلیم و تدریس، خیالات و افکار کے ارتقا کے دوش بدوش نہیں چل سکتی۔ اس کا ایک سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ دیہات کے مالی وسائل محدود ہوتے ہیں اور ایسے مدارس کی ضروریات کو پورا کرنے

پر قادر نہیں، جن کی غرض جدید طریق پر تعلیم دلانا ہو۔ دوسرے یہ کہ دیہات کے مدارس کی تعلیم کا، دیہات کے باشندوں کے طریق کار سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لیے اگر ہم اس تعلیم کی ترقی و اصلاح چاہیں، تو ہمیں مفید مطلب اقتصادی انقلاب کا انتظار کرنا ہو گا۔ گویا مختصراً یہ کہ اس تعلیم کے عیب کا ذمّے دار دیہات میں سرمائے کی کمی کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ جب تک مالی بے چارگی دیہاتی مدارس کے راستے کی روک بنی رہے گی اور جس وقت تک دولت کی اس موجودہ تقسیم کی بنیاد مساوات کے زرّیں اصول پر نہیں رکھی جائیگی، جس کے سبب سے دیہات یقیناً خسارے میں ہیں۔ مدارس زیادہ مفید نتائج پیش نہیں کر سکیں گے۔ حسبِ ضرورت عمارتیں نہیں کھڑی کی جاسکیں گی۔ عملی درس و تدریس کا ساز و سامان وسیع پیمانے پر مہیّا نہیں ہو سکیگا اور شہری مدرسوں کے سے کھیل اور تفریح کے اسباب نہیں بہم پہنچ سکیں گے۔ گویا دیہاتی مدارس شہری مدارس کے ہم پلّہ نہیں بن سکیں گے، لیکن نہ یہ صحیح ہے کہ اس عیب کے ذمّے دار تنہا دیہاتی مالیات ہیں، نہ یہ درست ہے کہ اقتصادی حالت کے انقلاب تک دیہاتی مدارس کو اپنی اوسط حالت پر قناعت کر لینا چاہیے۔

یہ صحیح ہے کہ دیہات کے مالی وسائل محدود ہیں، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ کم و بیش جو وسائل میسّر ہیں، ان سے بھی تو پورا پورا استفادہ نہیں کیا جاتا۔ تعلیمی مواد

جو ہمیں دیہات میں میسر آتا ہے، اُسے دیہاتی مدارس پوری طرح استعمال نہیں کرتے۔ بہت کم مدرسے ایسے نظر آئیں گے، جو دیہاتی زندگی کے رجحان کے موافق کام کر رہے ہوں۔ دوسرے ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ شہری مدارس تعلیم دلانے کی معیاری درسگاہیں ہیں بھی یا نہیں؟ اور اگر ہیں تو کیا یہ مدارس دیہاتی مدارس کے لیے نمونہ ہو سکتے ہیں؟ ہمیں اس میں شبہ ہے۔ تعلیم کے اصول ہر حالت میں ایک ہیں، خواہ مدرسہ دیہاتی ہو یا شہری۔ کوئی مقررہ اور معیاری طریقے ایسے نہیں، جن کے ذریعے ان اصول پر کاربند ہو سکیں، لیکن شہری اور دیہاتی مفاد میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے، اس لیے شہری اور دیہاتی مدارس کے طریقِ کار بھی مختلف ہیں۔ شہری مدارس کی جماعتوں میں طلبہ کی کثرت ہوتی ہے۔ اس لیے اس کثرت کی تنظیم بھی خاص ہونی چاہیے اور اس تنظیم کے لیے فنّی مہارت بھی خاص۔ دیہاتی مدارس کی خوش قسمتی سمجھیے کہ ایسے امور ان کی پریشانی کا موجب نہیں ہیں۔ دیہاتی مدرسے کو قدرتی ماحول کے اعتبار سے شہری مدرسے پر فوقیت حاصل ہے۔ فطری ذرائع جو دیہات کو میسر ہیں، شہروں کو میسر نہیں اور اگر ہیں، تو مصنوعی طریقوں سے حاصل کیے گئے ہیں۔

دیہاتی مدارس کے امکانات کا تذکرہ کوئی نئی بات یا نیا موضوع نہیں، سالہا سال سے ان کے متعلق نظریے قائم کیے جاتے ہیں اور ماہرینِ تعلیم دیہاتی

زندگی کی ضروریات کے موافق تعلیم کی نشر و اشاعت میں کوشاں ہیں، لیکن باایں ہمہ ہمارے دیہاتی مدرسے دیہاتی وسائل و ذرائع کو صحیح طور پر استعمال نہیں کرتے اور نہ دیہاتی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ہم یہ تو اُمید رکھتے ہیں کہ مدرسے کی تعلیم دیہات کی سماجی ضروریات کے موافق ہو، لیکن ان مدارس کی تنظیم، نگرانی اور اساتذہ کی تربیت سے غافل ہیں۔ دیہاتی تعلیم کی غیر تسلی بخش صورت حال اور ترقی یافتہ افکار و خیالات کو ملحوظ خاطر رکھیں، تو مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ذرائع اور وسائل کو ترقی دی جائے، جو اب تک، موجودہ لائحہ عمل کو کامیاب بنانے کا موجب ہیں۔

اگر دیہاتی مدارس تجسّس و غور کا مادہ نہیں پیدا کر سکتے، تو ہم سمجھیں گے کہ دیہات کا ماحول ہی مدرسے کے لائحہ عمل کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر دیتا ہے اور تعلیم کے متعلق ہمارے خیالات صحیح نہیں یا یہ کہ ہمارے ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے والے اچھی طرح کام نہیں کرتے۔

اگر ان میں پہلا سبب درست ہو، تو لازم ہے کہ ہم تعلیم کے ان مقاصد ہی کو خیرباد کہہ دیں، جنھیں ہم نے ایک طویل مدت سے بے جا اہمیت دے رکھی ہے اور ان کی جگہ ایسے مقاصد کو دیں، جو زیادہ معقول بھی ہوں اور آسانی سے حاصل بھی ہو سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ اگر ہم حقائق کے مطابق اپنے معیار میں ترمیم

کرلیں، تو یقیناً مفید ہو سکتا ہے، لیکن فوری توجہ اس امر کی طرف مبذول کرنی چاہیے کہ ہمارے خیالات کو عملی جامہ پہنانے والے عامل اچھی طرح کام کرنے لگ جائیں۔

تحقیق سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مقررہ طریقوں پر کام تو ایک مشین کی صورت میں ہوتا جا رہا ہے، لیکن صحیح دیہاتی تعلیم کی نشرواشاعت کے مقصد کو پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا۔ مثال کے طور پر یہ سوال پیدا ہو سکتے ہیں کہ کیا اساتذہ کی فنّی تربیت دیہاتی مدارس کے موجودہ حالات کے مطابق ہوئی ہے؟ کیا نصابِ تعلیم نے اساتذہ کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ دیہات کے سماجی، اقتصادی اور تمدّنی مسائل کو کامیاب بنانے میں مدد دے سکیں اور دیہاتی ماحول کی پیدا کردہ ضروریات کو پورا کر سکیں۔

تعلیمی لائحہ عمل کی بنیاد صرف اُستاد کی ذات پر ہے ــــ اُستاد ہی ایک ایسی شخصیت ہے، جس پر تعلیم کی سائنس کا انحصار ہے۔ اگر ہم اس کا تجزیہ کریں اور اس کے بنیادی عنصر کا جائزہ لیں، تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ سارے تعلیمی لائحہ عمل کو ٹھکانے لگانے والا اُستاد ہی ہے۔

ٹریننگ کالج میں تعلیم پانے والے متعلم کی کامیابی کا انحصار دو باتوں پر ہے۔ اوّل یہ کہ اس نے وہاں کی تربیت سے خود کہاں تک استفادہ کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ وہی تعلیم وہ اوروں کو کہاں تک خوش اسلوبی کے ساتھ دے سکتا ہے۔

اُستاد کی شخصیت، اس کی حرکات و سکنات، اندازِ گفتگو، طرزِ معاشرت کا مطالعہ کرنے سے اُستاد کی کامیابی کا راز معلوم ہو جاتا ہے۔ چونکہ بچے بڑی حد تک اپنے اُستاد ہی کا عکس ہوتے ہیں۔ وہ فطرتاً نقّال واقع ہُوئے ہیں اور اُستاد کی ہر بات کو جذب کر لینا چاہتے ہیں۔ اسی طرح اگر رہنمائی غلط طریق پر ہو رہی ہو، تو اس کے لیے یہی ایک تدبیر ہے کہ اساتذہ کو تعلیم دلائی جائے ۔۔ اور ایسی تعلیم جس کے ذریعے اساتذہ کو احساس دلایا جائے کہ نظریہ اسی وقت مفید ہو سکتا ہے، جب اس کو عملی جامہ بھی پہنایا جائے۔

اگر ہم چاہیں کہ دیہاتی مدرسے کے ذریعے سے دیہاتی زندگی کی اصلاح کریں، تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہمارے اساتذہ ایسی تعلیم حاصل کرنا شروع کریں، جو اُنھیں دیہاتی ماحول کے مسائل کو حل کرنے میں مدد دے۔ اگر وہ اس نوع کی تعلیم حاصل کر لیں اور مدرسے کی سماجی، تمدّنی اور اقتصادی ذمّے داریوں کو محسوس کر لیں، تو یہ ممکن نہیں کہ مدرسے کا طریقِ تعلیم اقتضاءِ وقت کے موافق عملی جامہ نہ پہنے۔

اسی طرح یہ خیال کر لینا بھی درست نہیں کہ اساتذہ کی تعلیم اُنھیں اس قابل نہیں بنا سکتی کہ وہ ان معلومات، رجحانات اور تجربات پر حاوی ہو سکیں،

جن سے دیہات کے باشندوں کو سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ دیہاتی اساتذہ کی تربیت کے لیے مندرجۂ ذیل امور مدِّنظر رکھنے چاہییں۔

اس کا مقصد علم و نظر تک محدود نہ ہو، بلکہ اس سے بلند ہو۔ وہ صرف یہی نہ جانتا ہو کہ کمرے کتنے بڑے ہوں اور ان میں کتنے ڈیسک اور کتنے تختۂ سیاہ رکھے جائیں وغیرہم۔ بلکہ اس سے زیادہ بھی اس کو علم ہونا چاہیے۔ ایک عام بچے کی حالت اور تعلیم کے طریقوں کو ہی جاننے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، بلکہ اس سے کچھ بالا ہو۔ ایک ضروری وصف یہ بھی ہونا چاہیے کہ دیہاتی اساتذہ اس بات پر قادر ہوں کہ اپنے آپ کو دیہاتی ماحول کے موافق ڈھال سکیں اور دیہات کے لوگوں میں گھل مل کر وہیں کی کائنات کے ایک جزو ہو جائیں اور پھر دیہاتی زندگی کو سدھارنے میں مدد دے سکیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہم نے اساتذہ کو اس معیار کی تعلیم دی ہے کہ اساتذہ کامیابی کے ساتھ دیہات کی خدمت بجا لا سکیں۔ ہم نے ان کے لیے اس سے زائد اور کچھ نہیں کیا کہ اُنھیں نفسیات، تاریخِ تعلیم اور اہتمام مدرسہ وغیرہم علوم کے نصاب سے پریشان کریں۔ ہم نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ انھیں تعلیم و تدریس کی ایک کل بنا دیں، مزید برآں یہ کہ انھیں کچھ عرصے کے لیے مدارس میں بھیجیں تاکہ وہ اپنی حاصل کی ہوئی تربیت کو بچّوں پر استعمال کر سکیں۔ ہونیوالے

اساتذہ سے اِداروں کو یہ اُمید وابستہ ہوتی ہے کہ لڑکوں کو وہ علوم پڑھا دیں، جن کو علمی اہمیت تو کافی حاصل ہے، لیکن عملی اہمیت حاصل نہیں اور تعلیمی لائحہ عمل کے علاوہ سائنس کے مبادی بھی۔ ایسی تدریس تو اُنھیں یونیورسٹی کے لیے تیار کرتی ہے، نہ کہ دیہات کے مدرسے کے لیے۔ ٹریننگ کالجوں اور نارمل اسکولوں میں صرف ابتدائی اور ثانوی مدارس کے طریقۂ نصاب میں فرق بتایا جاتا ہے اور جو کام اُن کو آگے چل کر کرنا ہوتا ہے، اس کے متعلق وہ کورے ہی رہتے ہیں۔

درحقیقت ان ٹریننگ کالجوں میں اس امر کی کوشش نہیں ہوتی کہ خاص خاص ماحول کے موافق بھی اساتذہ کو مقصدِ تعلیم سے روشناس کرایا جائے۔ ان میں دونوں قسم کی تعلیم (یعنی ان علوم کی تعلیم جن کی حیثیت صرف علمی ہو، مثلاً: فلسفہ، تاریخِ تعلیم وغیرہ اور ان علوم کی تعلیم جن کی حیثیت صرف فنّی ہو) عام حالات کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ نہیں بتایا جاتا کہ اس نوع کی تعلیم کو خاص خاص حالات میں عملی جامہ کیونکر پہنایا جائیگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تربیت کے ان اداروں سے جب طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں، تو بلند معیار کی عام تعلیم لے کر نکلتے ہیں۔ اس قسم کی تعلیم کے ذریعے انسان کا ذہن ہوا میں تو پرواز کر سکتا ہے، لیکن اس کے مطابق عمل نہیں کر سکتا۔ قابلِ افسوس یہ بات ہے کہ ٹریننگ کالجوں کے نصاب میں پیشہ ورانہ رنگ غالب نہیں ہوتا، بلکہ تعلیم عام یونیورسٹیوں کے طریق پر دی جاتی ہے، جس کی

ہونے والے اُستاد کو ضرورت نہیں۔ ہمارا فرض تو یہ ہونا چاہیے کہ ہم اس رنگ کو جو یونیورسٹی نے اس پر چڑھا رکھا ہے، ہلکا کر کے پیشہ ورانہ رنگ چڑھا دیں۔ یہ طلبہ اداروں سے عالم بن کر نکلتے ہیں۔ لیکن تنہا عالم بن جانے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ عالم جب علم کی دنیا سے نکل کر عمل کی دنیا میں پہنچتے ہیں، تو اُنھیں بہت سرگرداں ہونا پڑتا ہے۔ ان کی عام تعلیم اور فنّی نصاب کا عبور اُنھیں دیہاتی مسائل کے سمجھنے اور حل کرنے میں مدد نہیں دیتا۔ تعلیمی ذمّے داریاں جو اُنھیں یہاں پہنچ کر نظر آتی ہیں، ان کے لیے بالکل نئی ہوتی ہیں اور ان کا تعلق کالجوں کی تعلیم سے نہیں ہوتا۔ یہی ذمّے داریاں ایسی ہیں، جن سے اب انھیں عہدہ برآ ہونا ہے ۔ ان کے بغیر وہ دیہاتی سماج کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔

یونیورسٹی کے علوم کا نصاب بڑی حد تک مفید ہے اور یہ نصاب اساتذہ کے لیے تو اور بھی زیادہ مفید ہے، لیکن انھیں فنّی تربیت کی اس سے بھی زیادہ ضرورت ہے، چونکہ انھیں دیہات میں وہاں کے مخصوص حالات سے واسطہ پڑتا ہے، اس لیے رسمی نصاب کی اصلاح کر کے اسے حالات کے موافق ڈھالنا چاہیے۔ دیہات کے باشندے اقتصادی، سماجی اور حفظانِ صحت کی تعلیم سے قطعاً بے بہرہ ہوتے ہیں۔ ٹریننگ کالجوں کو ان امور کی طرف بھی توجہ دینا چاہیے۔ تجربے نے یہ حقیقت آشکار کر دی ہے کہ ٹریننگ کالجوں میں اساتذہ کی جو رسمی سی تربیت ہوتی ہے، وہ میدانِ

عمل میں مفید ثابت نہیں ہوتی۔ ان کا عمل ان کے علمی نظریوں کے دوش بدوش نہیں چل سکتا۔ یہ درست ہے کہ تعلیم میں جو خامیاں ہیں، ان کا موجب کچھ وہ اساتذہ بھی ہیں، جنھوں نے کالجوں یا مدارس میں باقاعدہ تربیت نہیں حاصل کی ہوتی، لیکن یہ بھی درست ہے کہ پڑھانے کا طریق جو یہ غیر تربیت یافتہ اُستاد اختیار کرتے ہیں، کم و بیش وہی ہوتا ہے، جو ٹریننگ کالجوں اور نارمل اسکولوں میں بتایا جاتا ہے۔ یہ طریقہ دیہات کے ماحول کے موافق تعلیم دینے میں ناکام رہا ہے۔ ٹریننگ کالج اور نارمل اسکول طریقۂ تعلیم کے ذمّے دار ہیں اور اگر مدارس کی تعلیم میں کوئی خامی نظر آئے، تو ہم یہ سمجھیں گے کہ اساتذہ کی تعلیم میں خامی رہ گئی تھی۔

اُستاد کی تعلیم ایسی بھی نہیں ہونی چاہیے کہ صرف دیہات کی ضروریات تک ہی محدود ہو۔ اس کی تعلیم جامع ہونی چاہیے کہ جونہی اسے واقعات کا سامنا کرنا پڑے، اس کی تعلیم اس کی رہنمائی اور دستگیری کرے۔

ان ٹریننگ کالجوں اور نارمل اسکولوں کا فرض یہ بھی ہونا چاہیے کہ جب لڑکے فارغ التحصیل ہو جائیں، تو اُنھیں ایک خاص مدّت کے لیے اپنی زیرِ نگرانی مدارس میں تعیّنات کر دیں اور باقاعدگی کے ساتھ جائزہ لیتے رہیں کہ کیا یہ طلبہ اسی طریق پر تعلیم دے رہے ہیں، جو اُنھیں کالج میں بتائے گئے تھے۔ آج کل یہ تجویز پیشِ نظر ہے کہ ٹریننگ کالج کے نصاب کی مدّت تعلیم دو سال کر دی جائے۔ ہمارا خیال ہے

کہ ان میں ایک سال علمی درس کے لیے وقف کر دیا جائے اور دوسرا سال عملی درس کے لیے۔ دوسرے سال کے لیے طلبہ کو کچھ رقم بطورِ وظیفہ محکمہ کی طرف سے ملنی چاہیے۔

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ ٹریننگ کالجوں اور نارمل اسکولوں سے فارغ التحصیل ہو کر طلبہ کو جن واقعات و حالات میں کام کرنا ہوتا ہے، ان سے یہ کالج اور اسکول خود آگاہ نہیں ہوتے۔ اگر فارغ التحصیل طلبہ کو کافی عرصے کے لیے زیر نگرانی اسکولوں میں تعیّنات کر دیا جائے، تو اس سے دو فائدے ہونگے۔ اوّلاً یہ کہ ان اساتذہ کی وجہ سے دوسرے اساتذہ کا بوجھ ہلکا ہو جائیگا، جو وہاں پہلے سے تعیّنات ہیں اور وہ اساتذہ اور زیادہ مفید کام کر سکیں گے۔ دوسرے یہ کہ فارغ التحصیل اساتذہ کو اس سلسلۂ تدریس میں جو مشکلات نظر آئیں گی، ان پر کالجوں میں جاکر بحث و تمحیص کرینگے۔ اس سے کالج کے اساتذہ کو بھی ان مشکلات کا احساس ہو جائیگا اور مزید اصلاح و درستی کی گنجائش نکل آئیگی۔

ٹریننگ کالجوں میں ایسے نصاب کا بھی اضافہ ہونا چاہیے، جو دیہاتی ماحول کے موافق ہو اور جس کے ذریعے اساتذہ کو کھیتی باڑی کرنے، غلّہ کی حفاظت، خرید و فروخت اور حفظانِ صحت کی نگہداشت کے اصول سکھائے جا سکیں۔ یہ نصاب دیہات کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کریگا۔ اس نصاب میں لوچ ہونا چاہیے تاکہ وقت کے

اقتضاء کے موافق تبدیل کیا جا سکے۔ تعلیم کی سائنس کو صحیح اہمیت اس وقت حاصل ہوگی۔ جب ٹرینگ کالج، دیہات کے واقعات کے موافق عملی جامہ پہنانا شروع کرینگے۔ اس صورت سے اساتذہ کی تعلیم محض نظریاتی نہ ہوگی، بلکہ عملی ہوگی۔ جن مدارس میں اس طریق پر تعلیم دی جائیگی، وہ کسی خاص صورتِ حال ہی کے مطابق نہ ہوگی، بلکہ بہت جامع ہوگی۔ مدارس، عالموں کی یونیورسٹیاں نہیں رہیں گی، بلکہ ایسی درس گاہیں بن جائیں گی، جہاں سماجی ضروریات کی تعلیم کو مقدم خیال کیا جائے گا۔ اساتذہ ملکی نعمت ہونگے، جو صحیح قسم کی نشر و اشاعت کرینگے۔

بظاہر یہ لائحہ عمل کچھ ایسا نظر آتا ہے، جو آسانی سے حاصل نہیں ہو سکتا اور اس صورت میں زیادہ تر ذمّے داری ٹرینگ کالجوں پر عائد ہوتی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے، اگر ہم چاہیں کہ ہمارے نظریے اور عمل میں کامل امتزاج ہو، تو اس کی صورت یہی ہے۔ اگر اساتذہ اپنی ذمّے داریوں کو نہ سمجھیں، جو تعلیم کی طرف سے ان پر عائد ہیں، تو وہ تعلیم کے مقاصد کو پورا نہیں کرینگے۔ اگر دیہات کی تعلیم میں اصلاح مقصود ہو، تو ضروری ہے کہ اساتذہ اُنھیں طریقوں کو اختیار کریں، جو مطلوب اصلاح و درستی میں مدد دیں۔ ٹرینگ کالجوں کا فرض ہے کہ اساتذہ کی اس طرح تربیت کریں کہ وہ دیہات میں جا کر اپنا کام صحیح اور کما حقہٗ طور پر انجام دے سکیں۔

انسانی کھیتی کے کسان

دسمبر کے مہینے میں کم وبیش ہر ہندوستانی یونیورسٹی میں تقسیم اسناد کے جلسے ہوتے ہیں۔ بی اے، ایم اے کی اور دیگر ڈگریاں کامیاب طلبہ کو دی جاتی ہیں اور یوں نئے بی اے اور ایم اے فضائے حیات میں رونما ہو جاتے ہیں۔ کیسی مبارک تقریب ہے کہ حق دار کو اس کا حق، محنت کش کو اس کا صلہ، یعنی، ہر کامیاب متعلم کو اس کی دماغی حیثیت کی سند مل جاتی ہے یا یوں سمجھیے کہ ٹکسال میں ہر سکّے پر مہر ثبت کر دی جاتی ہے۔ تقسیم اسناد کے موقع پر دستور ہے کہ یونیورسٹی کسی جلیل القدر شخص کو خطبۂ علمیہ کی دعوت دیتی ہے، یعنی، ہر سال ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں سترہ، اٹھارہ خطبات پڑھے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان خطبات میں ملک کی تعلیمی حالت، اقتصادی ضروریات اور اخلاقی وتمدّنی ترقیات کا ذکر ہوتا ہے

اور اس لیے ان کا مطالعہ ہم مدرسین کے لیے نفع سے خالی نہیں۔

ہمارے پاس اتنا موقع اور وقت نہیں کہ کسی ایک سال کے تمام خطبات پر فرداً فرداً نقد و نظر پیش کر سکیں، لیکن یہ ممکن ہے کہ ان خطبات کا ماحصل اجمالی طور پر پیش کر دیں۔ الفاظ کی نشست اور بیان کے اسالیب سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام خطبات میں مندرجۂ ذیل امور پر بحث و تمحیص کی گئی ہے:-

ا۔ ہماری یونیورسٹیوں کی تعلیم ناقص اور دور از کار ہے۔

ب۔ ہماری یونیورسٹیوں کو ایسے مضامین کی تدریس کرنا چاہیے، جن سے معاش کا حصول ممکن اور آسان ہو جائے۔

ج۔ ہماری یونیورسٹیاں بہت اچھی ہیں اور نہایت مفید کام کر رہی ہیں۔

د۔ کوئی دستورِ تعلیم جس کی بنیاد مادری زبان پر نہیں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

کم و بیش یہی باتیں ہر سال کہی اور سُنی جاتی ہیں، لیکن شاید ہم لوگ اس کے معنے سمجھنے سے قاصر ہیں کہ پھر ان کے اعادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہر حال ملک کے سر برآوردہ، علم و عقل کے سمندر، قوم و ملک کے دردمند اور بہی خواہ حضرات یہ سب بیان کرتے ہیں اور اس لیے ہمیں بلا تامّل یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ باوجود تناقص معنی کے یہ باتیں قابلِ غور ہیں، چونکہ ان حضرات کی عمر اسی میدان میں بادیہ پیمائی کرتے گزری ہے،

اور یہی نتائج ہیں، جنھیں وہ مترتب کر چکے ہیں۔ بالعموم ان اعلانات کو وقیع بنانے کے لیے دلائل ہماری ڈگریوں کی ناقدری اور کساد بازاری سے حاصل کی جاتی ہیں اور ہماری تعلیم کے نقص کا یہی صریحی اعلان پیش کیا جاتا ہے کہ عمر کے چودہ پندرہ سال، اتنا روپیہ اور وقت صرف کرنے کے بعد ہمارا ڈگری یافتہ بے حیثیت ہے اور بازار میں مارا مارا پھرتا ہے کہ کوئی اس کی جنس کم عیار کا گاہک بن جائے۔

اس کساد بازاری کے اسباب وعلل پر بحث کرنے کو جی چاہتا ہے، لیکن خوف ہے کہ بحث بہت طویل ہو جائیگی۔ کیا کیا ان کہنی، کہنی پڑ جائیگی، اس لیے اس سے قطع نظر کی جاتی ہے اور صرف مدرس کی ذمّے داریوں کے اجمالی ذکر پر قناعت کی جاتی ہے۔

کسان نے کھیت میں پہلے پانی دیا، ہل چلایا، کھاد دی، کوڑا کرکٹ اور سبزۂ بیگانہ سے کھیت کو پاک کیا، بیج بویا اور پھر آبیاری اور نگہبانی میں مصروف ہو گیا۔ فصل پک کر تیار ہو گئی۔ کسی نے بیگہ میں چار من غلہ کاٹا اور کسی نے سولہ من بھی۔ کسی کا دانہ پختہ اور اچھا رہا اور کسی کا دانہ کچا اور کمزور۔ بازار میں جنس گئی اور فروخت ہوئی۔ کبھی اونے پونے بکی اور کبھی من مانے دام وصول ہوے۔ یہی سلسلہ جاری ہے۔ ہر سال کسان "پیداوار" کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور ہر سال جنس بازار میں جاتی ہے۔

اسی طرح ہم مدرسین بھی کسان ہیں۔ اجناس کی فصل پانچ چھ ماہ میں تیار ہوتی ہے،

لیکن ہماری فصل پندرہ سولہ سال میں۔ ہر بیش قیمت جنس کی تیاری میں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے۔ ہر دسمبر میں جب ہماری فصل تیار ہو کر بازار میں جاتی ہے، تو ہماری آنکھیں بھی کسان کی آنکھوں کی طرح خریدار کے منہ پر جمی ہوتی ہیں۔ ہمارا دل بھی بازار کا نرخ سُن کر دھڑکتا ہے۔ کبھی خوشی سے، لیکن اکثر خوفِ کم بضاعتی سے کسان اپنے کام کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور آئندہ فصل میں احتیاط کرنے کا عہد کرلیتا ہے۔ محکمۂ زراعت کی مدد اس کی شامل کار ہے۔ اس کا کام آسان ہے، لیکن ہم مدرسین کا کام بہت دشوار ہے۔ ہماری ذمّے داری بہت بڑی ہے۔ ہماری محنتوں کا نتیجہ، یعنی، ہماری تیار کردہ جنس کی مدّتِ حیات گیہوں چنے سے زیادہ ہے۔ اس کا اثر صرف سماج کے معدے ہی پر نہیں، بلکہ سماج کے ہر شعبۂ حیات پر پڑتا ہے، اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم خواہ تعلیم و تدریس کے کسی شعبے سے وابستہ کیوں نہ ہوں، ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہیں کہ ہمارے طلبہ میں :۔

۱۔ علم کا حقیقی شوق اور علم کی حقیقی عظمت پیدا ہو جائے اور مدارس سے یا یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی وہ اپنے مذاق اور دلچسپیوں کے مطابق اپنی تعلیم جاری رکھیں۔

۲۔ یہ احساس پیدا ہو جائے کہ علم جسمانی محنت اور مشقت کی عظمت کا اعلان کرتا ہے اور دنیا میں کوئی کام ادنٰے یا ذلیل نہیں۔

۳ - علم کا مقصد یگانوں سے بیگانہ بنانا نہیں، بلکہ بیگانوں سے بھی یگانگت پیدا کرنا ہے۔

۴ - کامیاب زندگی کے معنی صرف حصول دولت ہی نہیں، بلکہ اپنے ملک اور اپنے علاقے سے جہل، افلاس اور بیماری کا دور کرنا ہے۔

اگر ہم جنسِ انسانی کے کسان یہ فیصلہ کرلیں کہ یونیورسٹی کی ڈگری کے ساتھ ساتھ ہمارے نوجوان مندرجۂ بالا اقدارِ حیات لے کر میدانِ عمل میں شریک ہونگے، تو یقین مانیے کہ ہماری تعلیم دنیا کی بہترین تعلیم ہوجائیگی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مدارس میں تعلیم دینے والے حضرات کو ابتدائی محنت برداشت کرنی پڑیگی اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارا طبقہ فخریہ کہہ سکیگا کہ ہم نے اپنی کوششوں میں کمی نہیں کی۔ ؎

گندم از گندم بروید جو زِ جَو از مکافاتِ عمل غافل مشو

فلم اور تعلیم

فارسی کی ایک کہاوت ہے، شنیدہ کے بود مانند دیدہ، جس کا مطلب ہے کہ کانوں سے سُنی ہوئی چیز کا آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیز سے کیا مقابلہ۔ بالفاظ دیگر یہ اس بات کا اعلان ہے کہ آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیز کے نقوش کانوں سے سُنی چیز کے مقابلے میں زیادہ واضح، زیادہ روشن اور زیادہ دیر پا ہوتے ہیں۔ ایسی کہاوتیں نوعِ انسانی کے پشت ہا پشت کے مشاہدے پر مبنی ہیں اور بالعموم ان کے سچ اور جھوٹ کی پرکھ نہیں کی جاتی۔ دس کار آمد باتیں ہیں، تو دس بالکل مہمل، لیکن اس کہاوت، یعنی، "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" کا جھوٹ اور سچ تو خوب پرکھا جا چکا ہے۔ مَیں تعلیم کے سلسلے میں جب اس پر غور کرتا ہوں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فنِ تدریس کا ایک اہم راز اس کہاوت میں پوشیدہ ہے اور ایسا راز کہ

جس کی ہر زمانے اور ہر ملک میں خوب تحقیق ہو چکی ہے۔

ہر کامیاب مدرس اپنے طلبہ کو سبق پڑھاتے ہوئے، ایسے ذرائع استعمال کرتا ہے کہ کتاب میں پڑھے ہوئے، حالات اور واقعات کی وضاحت ہو جائے۔ وہ زبانی توضیح اور تشریح پیش کرتا ہے۔ وہ تختۂ سیاہ پر چربے اُتارتا ہے۔ طرح طرح کے نقوش بناتا ہے۔ تصاویر دکھاتا ہے اور ہر وہ ممکن کوشش کرتا ہے، جس سے ایک بیجان پنجر، گوشت اور پوست سے مرصّع ہو جائے۔ یہ سب وہ اس لیے کرتا ہے کہ آنکھوں کی معرفت حاصل کیے ہوئے تاثرات، صرف کان یا دیگر حواس کی معرفت حاصل ہونے والے تاثرات سے کہیں زیادہ صاف، روشن، واضح اور دیرپا ہوتے ہیں۔

ہم اپنے گرد و پیش کا علم کس طرح حاصل کرتے ہیں؟ اپنے حواس کی معرفت۔ کان سُنتا ہے، زبان چکھتی ہے، جسم سردی اور حرارت کا حال بتاتا ہے، رگ، پٹھے، وزن اور تکان کا اندازہ کرتے ہیں، لیکن آنکھ تمام حواس کی تعبیر اور تشریح میں ہر دم مشغول ہے اور حتی الامکان تمام جسم اور حواس کی آسائش کی کفیل۔

آپ نے اندھے فقیروں کی صدا سنی ہو گی۔ "بابا آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔" درحقیقت آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔ اگر یہ نہیں، تو چشم تصور نہیں۔ یہ نہیں، تو بصارت نہیں۔ یہ نہیں، تو بصیرت نہیں۔ انسانی علم اور تجربے کا بیشتر انحصار

انھیں پر تو ہے، لیکن وہ آنکھ کیا، جو موجود ہو اور دیکھ نہ سکتی ہو اور وہ مواقع کیا، جو دیکھنے والی آنکھ کے لیے اسبابِ تصوّر، اسبابِ بصارت اور اسبابِ بصیرت پیدا نہ کر سکیں۔

اب مدرّس کے نقطۂ نگاہ سے دیکھیے۔ وہ سبق پڑھاتے ہوئے دُور دراز کے ملکوں اور گئے گزرے زمانوں کا ذکر کرتے ہوئے "خواب ندیدہ را ہمہ تعبیر میکنند" کا مصداق ہے۔ کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، وہ حتی الامکان اس کی توضیح کر دیتا ہے لیکن اس کی کوششیں طلبہ کو محسوسات کی دنیا میں نہیں لے جا سکتیں۔

میرے اس دعوے کی مزید توضیح کے لیے ایک حکایت ملاحظہ فرمائیے:۔

پیدائشی اندھوں کے شہر میں ایک ہاتھی کا گزر ہوا۔ اندھوں نے ہاتھی کی جسامت کے افسانے سن رکھے تھے۔ سب کے سب اسے دیکھنے کے لیے اس راہ پر جمع ہو گئے، جدھر سے ہاتھی کا گزر ہونے والا تھا۔ ہاتھی آیا، یہ سب اندھے اس پر ٹوٹ پڑے اور لگے ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے۔ کسی کا ہاتھ ٹانگ پر پڑا اور کسی کا سونڈ پر، کسی نے دُم کو ٹٹولا اور کسی نے پیٹ کو۔ ہاتھی بدحواس ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اب یہ سب لوگ اکھٹے ہوئے اور اپنے اپنے علم کے مطابق ہاتھی کی شکل و صورت بیان کرنے لگے۔ ہاتھی کسی کے نزدیک کچھ تھا اور کسی کی رائے میں کچھ۔ لیکن اصلی ہاتھی سے ان اندھوں کا ہاتھی بہت مختلف تھا۔

اکثر و بیشتر یہی حال ہمارے بچوں کا ہوتا ہے۔ کتابوں سے حاصل کی ہوئی معلومات اس درجہ تشنہ ہوتی ہیں کہ ان سے مرتب شدہ نتائج زندگی میں کام نہیں آسکتے۔ فلم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ طلبہ کے لیے مشاہدے اور تجربے کے ایسے مواقع پیدا کر دیتا ہے، جو مدرسے کی روزمرّہ کی تدریس میں ممکن نہیں۔ فلم نصاب کے بیشتر مضامین کی تدریس میں مفید ثابت ہو چکا ہے۔ جغرافیہ، تاریخ، ابتدائی سائنس، معلوماتِ عامہ، حفظانِ صحت وغیرہ کی تدریس میں وہ دلکشی پیدا ہو جاتی ہے، جو ان مضامین کا حق ہے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ تجربہ اور مشاہدہ بذاتِ خود کوئی اہم شے نہیں۔ اُن کی اصلی اہمیت تو یہ ہے کہ یہ طلبہ میں غور و فکر کی عادت پیدا کر دیتے ہیں اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دورِ حاضر کے تعلیمی نظریے غور و فکر کو تعلیم کا اساس اولیں اور بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔

فلم کے مقاصد اور فوائد کیا ہیں؟ میرے خیال میں فلم کے مقاصد حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ تفریحی
۲۔ نشر و اشاعت یا پروپیگنڈا
۳۔ تعلیمی

ان تینوں مقاصد میں تفریحی مقصد سب سے عام اور ہمہ گیر ہے۔ نشر و

اشاعت حسب ضرورت حکومتوں اور اسی قسم کی مختلف جماعتوں کے نقطۂ نگاہ
سے مفید ہے۔ تعلیمی مقاصد کے لیے متمدن اقوام سالہا سال سے فلم کو استعمال
کر رہی ہیں، لیکن ہندوستان میں فلم کم و بیش صرف تفریحی مقاصد کے لیے استعمال
ہوتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں صرف نمود و نمائش کے لیے فلم کا استعمال مدارس میں
بھی کیا جاتا ہے، لیکن نہایت ہی بد سلیقگی سے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تفریحی پہلو
نمایاں اور بہت نمایاں ہو جاتا ہے اور تعلیمی پہلو بالکل مفقود۔ میں ذاتی تجربہ کی بنا
پر کہہ سکتا ہوں کہ بیشتر مدرسوں کے ہیڈ ماسٹر ہمیشہ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ تعلیمی
فلموں کے ساتھ مذاقیہ فلم بھی دکھائے جائیں، یعنی آتش فشاں پہاڑوں کے فلم کے
بعد چارلی چپلن کے مسخرے پن کا مظاہرہ بھی لازمی ہے، اب اس کا نتیجہ معلوم۔ دوسرے
دن طلبہ سے پوچھیے کہ کل کیا دیکھا تھا، تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ آتش فشاں پہاڑ
سے نکلنے والی آگ اور دھوئیں کا رنگ نہیں جما۔ البتہ چارلی چپلن کی ٹیڑھی ٹانگیں،
لمبا جوتہ اور چھوٹی مونچھیں بچوں کے دماغ پر اپنا اثر چھوڑ گئی ہیں۔ میرا یہ
مطلب نہیں کہ بچوں کی تفریح غیر ضروری ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ میری گزارش
صرف اس قدر ہے کہ اس طرح فلم دکھانے سے تعلیمی مقاصد پورے نہیں ہو سکتے، بلکہ
فلم اگر کامیاب ذریعہ تدریس بنانا مقصود ہو، تو یہ ضروری ہے کہ ٹریننگ کالجوں
میں فلم کو تدریسی مقاصد کے استعمال کرنے کے اصول و قواعد بھی سکھائے جائیں۔

منصوبی طریقۂ تعلیم آج کل بہت مقبول ہو رہا ہے اور غالباً اس کی مقبولیت روز بروز بڑھتی چلی جائیگی۔ فی الحال اس کامیاب طریقۂ تعلیم کے اور زیادہ کامیاب ہونے کی راہ میں ایک مشکل یہ ہے کہ ٹریننگ کالجوں میں منصوبی طریقۂ تعلیم کی عملی تعلیم کے ذرائع موجود نہیں، اگرچہ نئے مدرسین اس کے اصول اور طریقۂ کار سے واقف ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر فلموں کا استعمال تدریسی ضروریات کے لیے رواج پا جائے، تو منصوبی طریقۂ تعلیم کے اکثر لوازمات کو بہم پہنچانے میں مفید ثابت ہوگا۔

ابتدا میں صرف چند موضوعات کی تدریس میں فلم کا استعمال شروع کیا جا سکتا ہے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ مدرس اپنی جماعت میں اس بات کا اعلان کر دے کہ فلاں روز فلاں موضوع پر فلم دکھایا جائیگا۔ اس موضوع کی تدریس فلم دکھانے سے پہلے ختم کر دی جائے۔ خاص خاص اطلاعات کی طرف طلبہ کی توجہ مبذول کرائی جائے، تاکہ وہ فلم کو دیکھتے ہُوئے اُن کو مدِ نظر رکھیں۔ چند کتابیں اور مضامین مہیا کیے جائیں۔ اُستاد ان کتابوں سے متعلق اقتباسات طلبہ کو پڑھ کر سُنا دے اور ضروری توضیح و تشریح بھی کر دے۔ پھر فلم دکھایا جائے، اس کے بعد طلبہ سے فلم کے خاص خاص اور ضروری حصّوں پر گفتگو کی جائے۔ کچھ اور کتابوں کے حوالے دیے جائیں اور طلبہ سے کہا جائے کہ فلم کے موضوع کے مختلف حصّوں پر وہ مضامین لکھ کر لائیں۔ ظاہر ہے کہ ایک فلم کو دیکھنے کے لیے طلبہ کو کافی تیاری کرنا پڑیگی اور

دیکھ لینے کے بعد بھی کافی کام کرنا پڑے گا اور اس طرح طلبہ میں تجزیہ کرنے کی قوت نیز تعمیری اور تخلیقی قوتیں بروئے کار آئیں گی۔

فلم کے متعلق مندرجۂ ذیل اطلاعات دلچسپی کا باعث ہونگی۔

تین طرح کے فلم بازار میں بآسانی دستیاب ہو سکتے ہیں:-

۱- ۳۵ ملی میٹر کے۔ یہ بڑے سائز کے فلم ہوتے ہیں، جو سینما گھروں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔

۲- ۱۶ ملی میٹر کے اور

۳- ۸ ملی میٹر کے۔ یہ دونوں چھوٹے سائز کے فلم ہیں۔ تعلیمی ضروریات کے لیے ۱۶ ملی میٹر کے فلم مناسب تصور کیے گئے ہیں اور اس لیے یہ بہت مقبول ہوئے ہیں۔ ایک فلم چار سو مرتبہ بخوبی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

مذکورۂ بالا اقسام کے فلموں کے لیے مشین یعنی، پروجیکٹر بھی خاص خاص پیمائش کے ہوتے ہیں۔ ۳۵ ملی میٹر کی مشین تعلیمی ضرورتوں کے لیے مفید اور کارآمد نہیں۔ اس کا استعمال مشکل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ اتنی گراں ہوتی ہے کہ عام مدارس اس کو نہیں خرید سکتے۔ یہ بھاری اور بوجھل بھی اس قدر ہوتی ہے کہ اس کو ادھر اُدھر بآسانی لیے پھرنا ممکن نہیں۔ ۱۶ ملی میٹر چوڑی مشین کوڈک، ابگفا اور جی ای کمپنی کی ساختہ ساڑھے پانچ سو روپیہ سے لے کر نو سو روپیہ تک قیمت کی ہوتی ہیں۔

۸ ملی میٹر چوڑے فلموں کی مشینیں سستی ہیں، یعنی مہنگی سے مہنگی مشین ۳۸۰ روپیہ کی اور سستی سے سستی ایک سو ستر روپیہ کی۔

آج فلم بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ ہر ہائی اسکول کا ہوشیار اور محنتی سائنس ماسٹر بغیر کسی قباحت کے فلم تیار کر سکتا ہے۔ تعلیمی فلم کے تیار کرنے میں کچھ ایسی بڑی لاگت بھی نہیں آتی۔ گراں سے گراں فلم، جس میں دو زبانوں میں توضیحات درج کی گئی ہوں، پندرہ روپیہ سے لے کر بیس روپیہ میں تیار ہوتا ہے اور اس کی نقلیں اس سے نصف، بلکہ اس سے بھی کم قیمت پر مہیا کی جا سکتی ہیں۔ اگر ہندوستان میں فلموں کا استعمال تعلیم و تدریس کے لیے مستقلاً اور باالانتظام شروع ہو جائے اور ملک کے ہر حصّے میں مدرسین اپنے علاقے کے فلم تیار کرنا شروع کر دیں، تو آٹھ دس سال میں ہر صوبے میں ایسے فلموں کی ایک نہایت وسیع اور کار آمد لائبریری تیار ہو سکتی ہے۔ جس میں غیر ممالک کے فلموں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی بچوں کو اپنے ملک کے ہر حصّے سے واقفیت حاصل کرنے کا انتظام ممکن ہو گا۔ ہماری تعلیم کا ایک بڑا نقص رفع ہو جائیگا۔ وہ نقص کیا ہے؟ یہی کہ ہندوستانی بچے کا علم غیر مربوط ہے اور وہ اپنے ملک کے حالات سے بھی ناواقف ہے۔

فلم دکھانے کی مشین البتہ قیمتی اور گراں ہوتی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر مدرسہ اپنے لیے ایک مشین خریدے۔ ابتدا میں یہ کافی ہو گا کہ ہر صوبے کا سررشتۂ

تعلیم چند مشینیں خرید کر یا تو اپنے آدمیوں کی معرفت ان کے استعمال کا انتظام رکھے یا پھر مدارس کو اُن کے حصّے اور مطالبے کے مطابق مشین مستعار دیدی جایا کرے۔ پنجاب کے سررشتۂ تعلیم کے ایک ماتحت شعبے کے زیرِ اہتمام فلم دکھانے کا اہتمام ہے۔ ۳۷-۱۹۳۶ء میں صرف ایک سینما دکھانے والے نے ۵۳۳۸۳ بچوں کو ۱۰۵۶ فلم دکھائے۔

ان مدرسین کے لیے جو فلم کا استعمال مدارس میں کرنا چاہتے ہیں، کچھ نکات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، جن کو مدِّنظر رکھنا فائدے سے خالی نہیں۔

۱۔ تدریس کو فلم پر منحصر کرنے کے بعد طلبہ کے اندر سبق کے موضوع میں خاص دلچسپی ہو جاتی ہے۔ جماعت میں خاموش بیٹھے رہنے والے بچے بھی سبق کے متعلق گفتگو میں حصّہ لینا شروع کر دیتے ہیں۔

۲۔ طلبہ کی توجہ موضوع تدریس پر پہلے سے زیادہ مرکوز ہو جائیگی۔ وہ درسی کتابوں کے قصے اور مضامین سے فلم کے موضوع کی تشریح اور توضیح کرتے رہیں گے۔ البتہ کچھ سست بچے صرف فلم کے دیکھنے کو کافی سمجھیں گے، لیکن اگر مدرس درسی کتابوں میں بیان کی ہوئی اطلاعات کا مقابلہ فلم سے حاصل کی ہوئی اطلاعات سے کرنے کی کوشش کرے، تو یہ خامی بھی رفع ہو سکتی ہے۔

۳۔ فلم کے استعمال کے بعد طلبہ میں کتب بینی کا شوق بڑھ جاتا ہے اور

بالعموم طلبہ پہلے کے مقابلے میں نہ صرف زیادہ کتابیں پڑھتے ہیں، بلکہ معمول سے زیادہ مستفید بھی ہوتے ہیں۔

۴۔ منصوبی طریقۂ تعلیم کے اجرا میں فلم بہت مفید ثابت ہوتا ہے اور یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ طلبہ "منصوبے" کی تجویز اور تشکیل میں خاص دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

۵۔ فلموں کی مدد سے طلبہ کی تحریریں وضاحت اور واقفیت کا عنصر نمایاں ہو جاتا ہے یعنی، مشاہدہ اور تخیل زیادہ بروئے کار آتے ہیں۔

۶۔ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ درس کی مدد کے بغیر طلبہ اپنے گرد وپیش کے حالات کا مقابلہ فلم میں دیکھے ہوئے حالات سے کس حد تک کرتے ہیں۔ البتہ اگر مدرس چند باتوں کا اختلاف یا ہم رنگی طلبہ کے پیش نظر لے آئے، تو وہ اپنے گرد وپیش کے حالات کو فلم میں دیکھے ہوئے، حالات سے جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۷۔ طلبہ میں اطلاعات کو ترتیب دینے اور نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔

۸۔ مدرس کو خود بھی شغل تدریس سے زیادہ دلبستگی پیدا ہو جاتی ہے۔

یورپ اور امریکہ میں پچھلے دس بارہ سال میں فلم اور تعلیم کے موضوع پر اہم

تجربے کیے جا چکے ہیں۔ ہزارہا مدرسین اور پچیس تیس ہزار طلبہ کی مدد سے یہ تجربے کیے گئے اور متفقہ طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ فلموں کے استعمال سے طلبہ کی ذہنی ترقی کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ بچّے کی نفسیات اور دماغی کیفیات تمام کرۂ ارض پر کم و بیش یکساں ہیں اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہمارے بچے اِن اسبابِ تعلیم سے مستفید نہ ہوں، جن سے دنیا کی اور متمدن اقوام کے بچے مستفید ہو رہے ہیں۔

درسی کتابوں کے علاوہ مطالعۂ کتب

مدرسین اس بات پر متفق الخیال ہیں کہ خواندہ والدین کی اولاد بالعموم پڑھنے لکھنے میں جلد ترقی کر جاتی ہے۔ ظاہراً اس کی سب سے بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ گھر کا ماحول ایسے بچوں کی تعلیم میں اگر موافق اور مفید اثرات نہیں ڈالتا، تو کم سے کم متناقض اثرات بھی نہیں ڈالتا۔ ماں باپ کی دلچسپیاں اکثر بچوں کی دلچسپیاں بن جاتی ہیں اور جس گھر میں پڑھنے لکھنے کا چرچا، کتاب اور اخبار کا وجود ہو، وہاں خاص خاص صورتوں سے قطع نظر، بچے بھی پڑھنے لکھنے اور کتاب کاغذ سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ بچے، مدرّس کے پاس، دن میں چند گھنٹے رہتے ہیں اور ان گھنٹوں میں تمام وقت کے لیے کچھ نہ کچھ کام لازمی ہے۔ اکثر و بیشتر مدرسے میں کام کی نوعیت یہ ہے کہ مقررہ نصاب کی تدریس کی جائے اور وہ علم، جو اس

تدریس سے حاصل ہوتا ہے، بچوں کے حافظے میں محفوظ کر دیا جائے۔ اچھے اچھے مدارس اور قابل مدرسین اس علم کو نہ صرف طلبہ کے حافظے کا جز، بلکہ اُن کی زندگی کا جز بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اچھے مدارس اور قابل اساتذہ کے شاگرد بالعموم عام طلبہ کے مقابلے میں زیادہ کامیاب انسان بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن باوجود ان سب امور کے یہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ صرف مدرس کی زیرِ نگرانی تعلیم و تدریس اور صرف نصاب کی کتابوں کا رٹ لینا کامیاب بنانے کے لیے کافی نہیں۔

مدرّس سے بھی زیادہ ذمّے دار والدین کو ہونا چاہیے۔ اگرچہ یہ ظاہر ہے اور اکثر انصاف پسند والدین اس کو تسلیم بھی کرتے ہیں کہ والدین اپنے فرائض کی اہمیت کو سمجھنے اور دیانتداری سے ان فرائض کو انجام دینے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کوتاہی کے اسباب اور وجوہ متعدد ہیں۔ اکثر گھروں میں تو والدین خود علم سے بے بہرہ ہیں اور زندگی کی ناگوار اور تلخ کشمکش اُنھیں ع "چہ خورد بامداد فرزندم" سے زیادہ اپنی اولاد کی خدمت کا موقع ہی نہیں دیتی۔ اس کے علاوہ دوسری قسم آج کل کے متمدّن اور کامیاب والدین کی ہے، جو فکرِ معاش سے ایک گونہ آزاد اور اسبابِ حیات سے کسی قدر متمتع ہیں۔ وہ صرف اس قدر کافی سمجھتے ہیں کہ مہنگے مدارس میں اپنے بچوں کو داخل کر دیں اور اطمینانِ قلب کے لیے یہ سمجھ بیٹھیں کہ چند روپے زیادہ لینے والا مدرسہ اُستاد اور ماں باپ دونوں کے فرائض بوجوہ احسن انجام دے رہا ہے۔ ایک

تیسری قسم شاید ایسے والدین کی ہے، جو باوجود معاش کی کمی یا بصورت دیگر باوجود فراغ اور استطاعت کے یہ خوب سمجھے ہُوئے ہیں کہ اولاد کی تعلیم اور تربیت کی ذمّے داری کو تمام و کمال کسی اور پر نہیں ڈال سکتے اور خواہ مدرسہ کی تعلیم اور تدریس نہایت کامیاب ہے، خواہ معمولی درجے کی، ان کا فرض ہے کہ وُہ ہمیشہ مدرسہ اور مدرسے کی مدد اس طرح کرتے رہیں کہ اپنے بچّوں کی حتی الامکان دیکھ بھال خود بھی کریں۔

ان ہر سہ اقسام کے والدین کی توجہ "کتاب" کی طرف مبذول ہو جانے سے مدرسے کے کام میں مفید نتائج مترتب ہونے کی اُمید کی جا سکتی ہے، لیکن مندرجۂ ذیل سطور کے مخاطب دراصل مدرسین ہیں اور یہ طبقہ اس لیے بالخصوص مخاطب ہے کہ قوم کی تعمیر اور قومی سیرت کی تشکیل کا ایک اہم ذمّے دار یہ بھی ہے۔

آج حصولِ علم کے بے شمار ذرائع ہیں۔ شہری لڑکا اپنے گرد و پیش سے اتنی نئی نئی معلومات حاصل کر لیتا ہے، جو دیہات کے محدود ماحول میں میسّر نہیں آتیں۔ اخبارات، اشتہارات، سنیما، لیکچر اور خود شہری سماج اس قدر گوناگوں ہے کہ دیہات کی پُرامن و پُرسکون فضا وہ بوقلمونی پیش نہیں کر سکتی۔ میرا مقصد شہری اور دیہاتی زندگی کے حسن و قبح پر تبصرہ نہیں، میرا مدّعا تو صرف یہ اعلان کرنا ہے کہ والدین اور مدرسین کے لیے اس اختلاف مواقع کا سمجھنا اور اس سے اپنی اولاد اور اپنے طلبہ

کی تعلیم و تدریس میں ہر موقع پر فائدہ اُٹھانا ضروری ہے، لیکن آپ شہری اور دیہاتی مدارس کے کتب خانوں کو دیکھیے، تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس اختلاف کا احساس مدرسے کی لائبریریوں کے منتظمین کو بالکل نہیں۔ آپ زیرِلب ہنس رہے ہیں کہ ہمارے دیہاتی مدارس میں سرے سے لائبریریاں موجود ہی نہیں اور شہری مدارس میں بیحد نکمّی اور بیکار کتابیں لائبریریوں میں داخل کی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن باوجود ان کوتاہیوں کے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مدارس کے منتظمین اور سررشتۂ تعلیم دونوں، مدارس میں لائبریریوں کا ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔ مدرسے میں لائبریری کا موجود ہونا اور اس کا مناسب استعمال گوناگوں فوائد کا باعث ہو سکتا ہے۔

کسی مدرسے میں کتب خانے کے موجود ہونے سے طلبہ کو پڑھنے کی ترغیب دلائی جا سکتی ہے اور اگر طلبہ اسی عمر میں اپنے نصاب کے علاوہ یہ محسوس کر لیں کہ کتاب امتحان پاس کرنے کے علاوہ صرف پڑھنے کی لذّت کے لیے بھی پڑھی جا سکتی ہے، تو یہ یقین ہو سکتا ہے کہ اُنھیں پڑھنے کی عادت پڑ جائیگی اور عموماً یہ عادت ایک بار پڑ جانے کے بعد چھوٹا نہیں کرتی۔ مجھے اپنے ایک ہم سبق کی بات یاد ہے، جس نے ایف، اے میں فرسٹ ڈویژن لینے کے بعد یہ کہا کہ مجھ سے قسم لے لو۔ اگر کورس کی کتاب کے علاوہ کبھی کوئی اور کتاب چھوئی بھی ہو۔ مجھے اس وقت اس "عالم" سے

اپنا مرعوب ہونا یاد ہے، لیکن آج میں اس واقعے کو یاد کر کے ہنس دیا کرتا ہوں۔
دیکھیے، اکثر دو ہم سبق ایک ہی ساتھ بی۔اے یا ایم۔اے پاس کر کے زندگی کے
میدان میں قدم رکھتے ہیں، لیکن دس پانچ سال بعد دونوں مساعد حالات کے
ماتحت زندگی گزارنے کے باوجود اپنے اپنے علم اور اکثر اس علم کے ذریعے مزید
کامیابی میں مختلف ہوتے ہیں۔ ہم ایسے واقعات دیکھ کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ میاں
فلاں کی قسمت فلاں سے زیادہ اچھی ہے، لیکن ہم اس امر پر کبھی غور نہیں کرتے کہ
اس قسمت کے اچھے ہو جانے کا سبب اچھی قسمت والے کی عادات مطالعہ اور
پابندی اوقات ہیں۔ پانچ سال تک متواتر آدھ گھنٹہ روز مطالعہ کرنے والا آٹھ سو
ساٹھ گھنٹے تحصیلِ علم میں مشغول رہا ہے۔ پھر کیا یہ مدت ایک شخص کو کامیاب تر
بنانے کی کفیل نہیں ہو سکتی؟ اور یاد رکھنا چاہیے کہ اس شغل کی عادت مدرسے ہی
میں ڈالی جا سکتی ہے۔

ہم میں سے ہر ایک اپنی الگ دنیا بسائے ہوئے ہے اور حتی الامکان اسی
محدود دُنیا میں رہنا پسند کرتا ہے۔ دو وکیل کلب میں ملتے ہیں، پھر دیکھیے مقدمات
کی کیسی کیسی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ ہر وہ بات جو عدالت کے رُوبرو بیان کرنا
بھول گئے تھے، اب سمجھ میں آجاتی ہے۔ دو سوداگر یکجا ہوتے ہیں، سوائے منڈی
کے بھاؤ اور اجناس کی قیمت کے اُتار چڑھاؤ کے وہ کوئی اور بات ہی نہیں کرتے۔

دو ملازمت پیشہ جب اکھٹے بیٹھتے ہیں، تو سوائے حاکم کے مزاج اور اپنے عملے کے شاطر ہونے کے واقعات کے اُن کا حافظہ اور سب کچھ محو کر چکا ہوتا ہے اور جب یہ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے بڑھاپے میں تگ و دو کی زندگی سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں، تو سوائے داستانِ پارینہ کے اُن کے پاس کچھ اور رہتا ہی نہیں۔ کبھی آپ نے غور کیا کہ اس درجہ "یک فنی" ہونے کے وجوہ کیا ہیں؟ بیشتر یہ وہ لوگ ہوتے ہیں، جنھیں طالب علمی کے زمانے ہی سے خارجی دنیا سے کوئی علاقہ نہیں رہا جن کی دنیا مینڈک کی دنیا ہے، جہاں ایک چھوٹا سا تالاب ہی دُنیا کے بڑے سے بڑے سمندر سے بڑا ہے۔ کتابوں سے دلچسپی رکھنے والے اور کتابوں کے پڑھنے والے اس درجہ تنگ اور محدود دنیا میں نہیں رہتے۔ وہ تو خارجی دُنیا سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کے تجارب وسیع ہوتے ہیں۔ ان کے قلب روشن ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں دیکھتی ہیں اور ان کے کان سُنتے ہیں اور ان میں سے کوئی کوئی غالب کی طرح یہ بھی کہہ بیٹھتا ہے ؎

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
کاش کہ پرے ہوتا عرش سے مکاں اپنا

کسی نوجوان سے پوچھیے، میاں بی اے یا ایم اے، پاس کرنے کے بعد کیا کرو گے؟ عام نوجوان "ملازمت یا پھر کوئی اور کوشش معاش" کہہ کر بزعم خود آپ کو

شافی و کافی جواب دے دیگا۔ مقابلتہً زیادہ فہیم کچھ سوچ میں پڑ جائے گا اور کہدیگا،
کیا عرض کروں ابھی تو کچھ سوچا نہیں۔ یہ تمام کالج کی وہ مخلوق ہے، جسے خارج
از نصاب کتابوں سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ وہ لوگ ہیں، جنھیں اور اقوام کے نوجوانوں
کی زندگی کے اطوار و اسالیب اور مجاہدے و مجادلے کے اسباب سے آگاہی نہیں اور
نہ اُنھیں افراد کی قربانیوں کی اطلاع ہے۔ وہ تو نصاب کے چکر میں اسکول اور کالج کی
زندگی گزارتے رہے ہیں اور اب ننانوے کے پھیر میں زندگی گزار دینگے۔ انھیں زندگی
کے نہج، اقتصادی اثرات اور سیاسی کشاکش کو سمجھنے اور پرکھنے سے کبھی واسطہ ہی نہیں
رہا اور آج وُہ سماج میں اُن بھکاریوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، جو ٹٹو پر سوار
ہو کر بھیک مانگنے کے لیے نکلا کرتے ہیں۔ اگر کتابیں پڑھتے اور غور کرتے، تو شاید اُن
کی بے سر و سامانی آج اُن کے لیے اس درجہ تکلیف دہ ثابت نہ ہوتی۔

اب صرف مدرّس کے نقطۂ نگاہ سے دیکھیے، تو ظاہر ہے کہ اگر طلبہ کو خارجی
مطالعے کی عادت ہے، تو اُن کی معلومات بھی نسبتہً زیادہ وسیع اور اُن کی دلچسپیاں
زیادہ رنگین ہونگی اور ایسے طلبہ کی تدریس میں مدرس کو بہت آسانیاں میسر آجاتی ہیں۔
زبان علوم و فنون کا منبع ہے۔ ہر لفظ ایک مزاج اور شخصیت رکھتا ہے اور اس مزاج و
شخصیت کی اچھی پہچان اسی وقت ممکن ہے، جب اس لفظ سے بار بار اور مختلف
اسباب کے ماتحت میل جول ہو۔ آپ کے ملاقاتیوں کی فہرست میں تعلقات انھیں

سے قائم ہوتے ہیں، جن سے اکثر دوچار ہونے کا موقع ملتا ہے۔ جب یہ امر مسلمہ ہے، تو ظاہر ہے کہ کتابوں کو پڑھنے والے زبان کے اسالیب سے زیادہ واقف ہو سکتے ہیں اور اسی قدر اُنھیں لذّت بیان سے لطف اندوز ہونے کے مواقع مل سکتے ہیں۔ دنیا کے مشاہیر ہماری ملاقات کے منتظر ہوں اور اپنے سرمایۂ حیات میں سے وقیع ترین خزانے ہمیں دینے کے لیے بیتاب ہوں اور پھر بھی ہم اُن سے فائدہ نہ اُٹھائیں، تو یہ ہماری بدنصیبی کے سوا اور کیا ہے۔

درسی تعلیم اور وجہِ معاش

چند سال سے تمام دنیا میں بیکاری کی وبا عام ہے اور اب ہمارے ملک میں بھی ہر طرف سے یہی شکایت سُنی جاتی ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی بیکاری کا مسئلہ باقی رہ جاتا ہے۔ عام طور سے موجودہ تعلیم ہی کو اس بیکاری کا ذمّے دار قرار دیا جاتا ہے۔ ہر شخص جو کسی پلیٹ فارم پر تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے، موجودہ طریقۂ تعلیم، نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم کو ملک میں بیکاری کی بڑھتی ہوئی وبا کا ذمّے دار قرار دیتا ہے۔ ہر شخص، جو کسی اخبار کے صفحات پر دسترس رکھتا ہے، اپنے پلیٹ فارم پر بولنے والے بھائی کے مقابلے میں سبقت لے جانے کے خیال سے دستور و نظامِ تعلیم کی دھجیاں اُڑا دیتا ہے۔ یہ کاغذی پیرہن میں ملبّس حضرات بھول جاتے ہیں کہ اس طرح اپنے لباس کو تار تار کرنے سے عیوب برہنگی اَور بھی واضح ہو

جائیں گے اور ہر چند کہ ان حضرات کا مقصد حکومت کی کمزوری کا اعلان ہوتا ہے، لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کسی ملک کے تعلیمی نظام کی ذمّے دار صرف حکومت ہی نہیں بلکہ جمہور بھی ہے۔

بیکاری کے مسئلے پر مختلف نقطۂ خیال سے بحث و تمحیص ہو سکتی ہے۔ سپرو کمیٹی اپنی رپورٹ شائع کر چکی ہے۔ حکومتِ ہند اور صوبجاتی حکومتیں اس کمیٹی کی رپورٹ پر انتہائی غور و خوض کر رہی ہیں۔ اُمید کی جا سکتی ہے کہ جلد نتائج مترتب ہونگے اور اُن کے ماتحت تمام ملک میں بیکاری کو دور یا بڑی حد تک کم کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ مسئلۂ بیکاری پر ایک مفصل بحث پیش کروں۔ میں بیکاری کے مسئلے کو صرف دیہاتی اور ثانوی مدارس کے محدود اور معین نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتا ہوں۔

ایک لڑکا تحصیلی مدرسے سے مڈل کا امتحان پاس کر لیتا ہے۔ پٹواری کی اسامی کے لیے ضلع کے حاکم کے پاس عرضی گزرانتا ہے۔ وہ کئی سال تک بلا تنخواہ اُمیدواری کرنے کے لیے تیار ہے، لیکن پھر بھی اُسے اپنے ارادے میں کامیابی اور پٹواری کے عہدے پر تقرر کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس لڑکے کے والدین تحصیلی اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر مشورہ چاہتے ہیں اور بالعموم یہ مشورہ دینے والے حضرات پہلے تو مزید کوششِ ملازمت کی تلقین کرتے ہیں۔

نائب تحصیلدار صاحب اور تحصیلدار صاحب کی عنایات اور دلچسپی کے حصول کے ذرائع بتاتے ہیں، لیکن بالآخر یہ فرما دیتے ہیں کہ ابھی لڑکے کی عمر کم ہے اور یہ ہے بھی ذہین، اسے ضلع کے ہائی اسکول میں داخل کرا دو۔ وہاں سے انٹرنس پاس کرلے، تو پھر دیکھا جائیگا۔ اس وقت ملازمت کے حصول میں دقّت نہ ہوگی۔

جوں توں کر کے وہ مڈل پاس دیہاتی لڑکا ضلع کے ہائی اسکول میں داخل ہوگیا۔ شہری زندگی کی دلچسپیاں اسے اپنی طرف کھینچتی رہیں، لیکن وہ نہایت استقلال اور کامیابی سے ان کا مقابلہ کرتا رہا۔ اس کا نفس اس کے خیال کے مطابق دیہاتی ہی رہا۔ پتلون نما پاجامے، ٹوپی اور اسی قسم کے چند تغیراتِ لباس سے بھلا کوئی دیہاتی سے شہری تھوڑا ہی بن جاتا ہے اور ان تغیرات کا اثر اس کی تعلیمی ترقی پر نہیں پڑا۔ وہ مقررہ مدّت میں انٹرنس پاس کر کے پھر اپنے ماں باپ کی خدمت میں پہنچ گیا ہے۔ پٹواری گری کی کوشش پھر جاری ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ ضلع کے دفتر میں بابو کی نوکری کے لیے بھی کوشش ہوئی۔ صلاح کاروں نے پھر مشورے دیے، لیکن نتیجہ پھر کم و بیش وہی رہا، جو مڈل کے بعد ہوا تھا۔ فوج، پلٹن میں بھرتی ہونے کی کوشش بھی کی، لیکن پھر سب مشیروں کی رائے یہ ہوئی کہ نمبردار کے لڑکے کی طرح اسے بھی کالج میں بھیج دیا جائے۔ چار پانچ سال میں یہ اتنا ہی پڑھ جائے گا، جتنا ڈپٹی صاحب پڑھے ہوئے ہیں اور پھر کیا ڈپٹی صاحب کے دفتر میں بھی کوئی

اچھی جگہ اسے نہ مل جائیگی۔

وہ دیہاتی لڑکا پھر شہر کی طرف روانہ ہُوا۔ اس مرتبہ کالج میں داخل ہو گیا۔ یہاں شہری زندگی نے اس نوبہار علم کی دیہاتی معصومیت پر پھر حملے شروع کیے، لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ ظاہر البِاس، طریقِ نشست و برخاست و گفتگو اور چند ذرائع سیر و تفریح کی تلاش کے سوا یہ دیہاتی، دیہاتی ہی بنا رہا۔ چار پانچ سال کالج میں گزارے۔ بی اے، کی ڈگری مل گئی۔ فلسفہ اور عربی یا سنسکرت لے کر بی اے پاس کیا اور یہ نونہال واپس اپنے والدین کے قدموں میں پہنچ گیا۔ اس کے گاؤں میں اس کے علم کا شور مچ گیا، اِدھر اُدھر سے ہر چھوٹا بڑا اس سے ملنے آیا، تحصیلی مدرسے کے ہیڈ ماسٹر صاحب بھی اپنے شاگرد کی کامیابی پر تحفۂ تبریک لے کر آئے، لیکن ہمارا نہ بدلنے والا دیہاتی، اپنے اعزہ و احباب سے سلسلۂ گفتگو قائم نہ کر سکا۔ اگر یہ ہل اور بیل کی بات کرے، تو اعلانِ علم کیوں کر ہو اور یہ ملاقاتی تو اس کے علم کے حضور میں خراجِ تحسین لے کر حاضر ہُوے ہیں۔ اگر برگساں اور ہیگل کے فلسفے پر کچھ "شکر شکن" ہو، تو ان لوگوں کی سمجھ میں کیا آئیگا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کے مدّاح مشتاق ہیں اور یہ خاموش اور قومی مصلح تلخ بیان اور تلخ قلم ہو کر اس "ماجرے" کی حقیقت دریافت کرنے میں مصروف۔

آخر اس بی اے، پاس دیہاتی کو ملازمت مل گئی۔ مردم شماری کے نئے

کھلے ہُوے دفتر میں یہ بی اے پاس چالیس روپے کے مشاہرے پر ملازم ہوگیا، لیکن بدقسمتی دیکھیے اس محکمے میں بالائی آمدنی نام کو نہیں، صرف تنخواہ ہی کے چالیس روپے ہیں۔ بہرحال ہر ایک خوش ہے کہ لڑکا برسرِ روزگار ہے اور اب بیکار نہیں، درحقیقت ہماری نظروں میں یہ بیکار ہے۔ وہ روپیہ اور وقت اور محنت، جو اُس نے حصولِ تعلیم میں صرف کی، اگر کسی اور شغل پر صرف ہوتی، تو غالباً نتیجہ اس سے بدرجہا بہتر ہوتا۔ ہمارے خیال میں دیہاتی مدرسے کے ہیڈ ماسٹر نے یہ ظلم کیا ہے۔ یہ اس کا فرض تھا کہ وہ اپنے شاگرد کے متعلق صحیح اندازہ کرچکا ہوتا اور لڑکے کے والدین کو سمجھا دیتا کہ یہ لڑکا اس قسم کی تعلیم کا اہل نہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی یہ قسم عام ہے اور بازار میں اس کا خریدار مشکل ہی سے ملتا ہے۔ کسی ملک کے تمام افراد اگر عُمّالِ حکومت بن جانا چاہیں، تو اس حکومت اور ملک کے ذرائعِ آمدنی محدود ہی نہیں، بلکہ مسدود ہو جائیں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دیہاتی اسکول کا ہیڈ ماسٹر اور کیا رائے دے۔ کیا وہ یہ کہہ دے کہ تم کھیتی باڑی کے کام میں لگ جاؤ۔ گیہوں اور کپاس پیدا کرو اور اُسے بیچو۔ ان کا نرخ گھٹ گیا ہے، تو گھٹ جائے، لیکن معاش تو یقینی ہے؟

آج دنیا کی حالت بدل چکی ہے۔ کوئی ملک اپنی جغرافیائی حدود میں رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ سنیاسی اور صوفی مذہب کی حدود میں رہ کر راہبانہ زندگی

گزار سکتے ہیں، لیکن "اقتصادی راہب" خواہ ملک ہو یا فرد، وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ آمد و رفت اور بار برداری کے ذرائع اس قدر سستے اور سریع ہیں کہ ایک ملک کی جنس دوسرے میں فروخت ہوتی ہے۔ چین کا بیوپاری اپنا مال انگلستان لے جاکر بیچتا ہے۔ اس لیے خام جنس لے کر ہم بھی دوسرے ممالک کے ہاتھ فروخت کریں اور فائدہ اُٹھائیں اور یوں "اقتصادی سنیاسی" بھی بنیں اور اپنی جان اور جہان کو بھی قائم رکھیں، لیکن خام جنس کی قیمت ممالکِ غیر میں بہت کم ملتی ہے۔ میں دو من روئی بیچتا ہوں اور اس کے عوض مجھے بیس گز کپڑا ملتا ہے۔ میں آٹھ مہینے کی محنت میں وہ روئی پیدا کرتا ہوں اور دوسرے ملک کا آدمی ایک دن میں بیس گز کپڑا بناتا ہے، یعنی، میری اور اس کی مزدوری میں ایک اور ایک سو اسّی کی نسبت ہے اور پھر تماشا یہ ہے کہ میری اور اس کی ضروریات میں فرق بہت کم ہے۔ میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ دو من روئی کے عوض بیس گز کپڑا لوں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ میں دو من روئی کے عوض بیس من پیدا کروں، لیکن تبادُل اجناس کے نرخ میں تبدیلی میرے بس کی بات نہیں۔ صرف یہی ممکن ہے کہ میں اپنی ضروریات کا کفیل خود ہو جاؤں۔ جو چیز مجھے درکار ہے، اپنے ملک میں بناؤں۔ یہاں ہاتھ سے بنانے اور مشین سے تیار کرنے کا مقابلہ ہے۔ غرضکہ "افسانہ از افسانہ مے خیزد"۔

بیکاری کا مسئلہ درحقیقت اقتصادی ہے اور یہ تعلیم کے بس کی بات نہیں

کہ اس کا ازالہ کر دے۔ البتہ تعلیم ایک معقول حد تک ایسے آدمی پیدا کرنے میں ممد و معاون ہو سکتی ہے، جو ہوا کے رُخ کو پہچانیں اور جو خدمت اُنھیں تفویض کی کی جائے، اُسے بدرجۂ احسن تکمیل تک پہنچائیں۔

ہمارے دیہاتی اور ثانوی مدارس کے ہیڈ ماسٹر اس معاملے میں خاص طور پر مفید خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ اپنے طلبہ سے اچھی طرح واقف ہو جائیں اور حتی الامکان صرف مناسب اور موزوں طلبہ کو مزید تعلیم پانے کا مشورہ دیں اور بالعموم مختلف پیشوں کے متعلق تازہ بہ تازہ اطلاعات فراہم کرتے رہیں تاکہ مناسب مشورہ دے سکیں۔ ہر ضلع، ہر تحصیل، ہر قصبے اور گاؤں کی جغرافیائی خصوصیات کو مدِّ نظر رکھتے ہُوے، زراعت سے متعلق اور دیہاتی زندگی سے وابستہ مشاغل اور پیشوں کی فہرست مرتب کریں اور جس حد تک ممکن ہو، ان مشاغل اور پیشوں کو رواج دیں۔ تعلیم کا کام یہ نہیں ہے کہ معاش کی کفیل ہو جائے۔ البتہ تعلیم کا فرض یہ ہے کہ جب حصولِ معاش میں کوئی مصروف ہو، تو تعلیم کی معرفت حاصل کردہ اقدارِ حیات کامیابی اور کامرانی کے دروازے کھول دیں۔

ہمارے دیہاتی اور ثانوی مدرسین بھائیوں کا فرض ہے کہ حسبِ مقدور اپنے طلبہ میں کیریکٹر کی تشکیل کریں۔ ایک ایسے کیریکٹر کی جس میں :

۱۔ ہر قسم کی محنت اور مشقت سے خواہ وہ جسمانی ہو یا دماغی انہماک

ہو سکے۔

ب۔ دیانتداری اور راست بازی صرف قول تک ہی محدود نہ ہو بلکہ فعل میں بھی اسی قدر قابل لحاظ سمجھی جائے۔

ج۔ اپنی علمی اور پیشہ ورانہ استعداد کو بہتر سے بہتر بنانے کی ہر وقت فکر اور کوشش ہو۔

د۔ سماج کی آبرو اور عزت کی نگہبانی پیشِ نظر ہو، کیونکہ مقتدر اور باعزت سماج ہی افراد کی فلاح اور بہبود کا کفیل ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم

تعلیمی ارتقا کا یہ ایک راز ہے کہ اوّل سماج میں تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں اور اس کے بعد تعلیمی مقاصد اور تعلیمی نظام میں، یعنی، سماج خارجی اثرات اور اپنی داخلی ضروریات کے ماتحت بدلتا رہتا ہے اور تعلیم کے مقاصد اور دستور اس کے مطابق بدل جاتے ہیں، لیکن اگر تعلیم کے مقاصد اور دستور اس تبدیلی کے بعد یہ صلاحیت نہ رکھتے ہوں کہ سماج کی کمزوریوں پر نظر ڈال سکیں اور اپنا اساس اس طرح بدل لیں کہ سماج کی خامیاں اور نقائص دُور ہو جائیں، تو سمجھ لیجیے کہ وہ مقاصد اور دستور تعلیم صرف تدریس کی حیثیت رکھیں گے اور ان میں اس سے کچھ زیادہ کرنے کی صلاحیت نہ ہوگی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد کے ساتھ جب ہندوستان کا نظم و نسق درجہ بدرجہ

انگریزوں کے ہاتھوں میں آنا شروع ہُوا، تو کمپنی کو دفاتر میں اور چھوٹے چھوٹے عہدوں پر مقرر کرنے کے لیے ہندوستانیوں کی ضرورت ہوئی۔ اسی ضرورت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہُوئے، وارن ہیسٹنگز کے دورِ حکومت میں مدرسۃ العالیہ کلکتہ اور سنسکرت کالج بنارس کی ابتدا ہوئی، لیکن ۱۸۵۴ء میں سر چارلس وُڈ نے تعلیم کو بہ جائے خود بھی ضروری سمجھا اور ہندوستان کے دوسرے تعلیمی دور میں، جو ۱۸۵۵ء سے شروع ہُوا، صرف عمالِ حکومت کی تیاری ہی کو مقصدِ تعلیم قرار نہ دیا گیا۔ ۱۸۸۲ء کے ہنٹر کمیشن اور ۱۹۰۲ء کے یونیورسٹی کمیشن نے بھی اس کا اعلان کیا کہ تعلیم اعلیٰ طبقے کے لیے ہی نہیں، بلکہ عوام کے لیے ہونی چاہیے اور اس کا اوّلیں مقصد یہ ہونا چاہیے کہ یہ تمام ملک میں فلاح و بہبود کی داغ بیل ڈالے۔ جنوری ۱۹۱۲ء میں جشن تاجپوشی کے بعد شہنشاہ ہند جارج پنجم آنجہانی نے کلکتہ یونیورسٹی کے سپاس نامے کے جواب میں فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ ہندوستانی گھروں میں علم کی شمع روشن ہو جائے اور اس سے وہ اُجالا پھیلے، جو جمہور کی خوشی و خرمی اور آرام و ثروت کا باعث ہو۔

غرض بتدریج مقاصد تعلیمی میں تبدیلیاں ہوتی رہیں اور یہ سماج کی ضرورت کو مدِ نظر رکھ کر پیش کی گئی تھیں۔ ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ دستور اور نظامِ تعلیم میں کس قدر تبدیلیاں ہوئیں اور ان کا اثر کیا ہُوا، ایک مستقل موضوع ہے، جس پر یہاں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ اعلان ضروری ہے کہ یہ تبدیلیاں اس تیزی کے ساتھ نافذ نہیں کی گئیں، ما

جس قدر ضروری تھا اور یہ تبدیلیاں تعلیم کو مذہب سے اس قدر علیحدہ اور بے تعلق سمجھتی رہیں کہ ہمارے تعلیمی دستور میں صرف اقتصادی نقطۂ نگاہ ہی زور پکڑ کر رہ گیا۔ اب اس نئے دور میں، جو جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد شروع ہُوا ہے، ایک نئی تبدیلی ظاہر ہو گئی ہے اور افسوس کے ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس سماجی تبدیلی کا اچھی طرح تجربہ نہیں کیا گیا اور اگر کچھ مدّت اس سے اور بے پروائی کی گئی، تو یقینی ہے کہ سماج کے جسم پر ایک انتہائی تکلیف دہ اور بدنما پھوڑا ثابت ہو جائے۔

لڑکوں کی تعلیم پر آج ہر ہندوستانی اکثر بے سوچے سمجھے، اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتا ہے۔ وہ بیکاری، بیماری، بلکہ ہر سماجی کمزوری کا ذمّے دار ہمارے طریقۂ تعلیم کو قرار دیتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ خود اسی دستورِ تعلیم کا نتیجہ ہے اور اپنے متعلقین کو بھی یہی تعلیم دینے پر آمادہ ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس نئے دور میں لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیّت سے ہر شخص آگاہ ہے۔ اس کی ضرورت کا معترف ہے اور اکثر اس میں نقائص نکالنے میں بھی آمادہ نظر آتا ہے، لیکن ایمانداری اور توجہ سے اس مسئلے پر غور و خوض کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہر شخص پکار رہا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم عام ہونی چاہیے۔ ان کے لیے مدارس کھولے جانے چاہییں۔ ہائی اسکول اور کالج ضلع ضلع اور تحصیل تحصیل میں ہونے چاہییں۔

اب تصویر کا دوسرا رُخ دیکھیے۔ آج بھی ان مدارس کی فارغ التحصیل لڑکیاں

شہروں میں کافی نظر آتی ہیں اور اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ تعلیم کے مخالف انھیں لڑکیوں کو مثال کے طور پر پیش کر کے یہ کہتے ہیں کہ وہ تعلیم جو ان لڑکیوں کو دی جا رہی ہے، اچھے نتائج نہیں دکھاتی، یعنی، مسئلے کی صورت اب یوں ہو جاتی ہے کہ

۱۔ لڑکیوں کی تعلیم ضروری ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں۔

۲۔ لیکن یہ تعلیم، جو دی جا رہی ہے، غلط قسم کی ہے۔

پہلی بات متنازعہ فیہ نہیں۔ دوسری البتہ باعثِ اختلاف ہے، اس لیے اس کا تجزیہ ضروری ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ آج لڑکیوں کے مدارس میں اکثر و بیشتر وہی نصابِ تعلیم رائج ہے، جو لڑکوں کے مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تعلیم کا مقصد یہ نہیں ہو سکتا کہ سماج میں سے ایک صنف معدوم کر دی جائے۔ لڑکے اور لڑکیاں آگے بڑھ کر زندگی کے دو مختلف شعبوں کے ذمّے دار ہوں گے اور اس لیے ان کی تیاری اس نوع کی ہونی چاہیے کہ اس زندگی کے سفر میں مناسب توشہ اس کے ساتھ ہو۔ غالباً اسی بات کو مدّنظر رکھتے ہوئے، ہمارے لڑکیوں کے مدارس میں سینے پرونے، کھانے پکانے اور عام حفظانِ صحت کے اصولوں پر بھی وقت صرف کیا جاتا ہے اور یہ شاملِ نصاب ہیں، لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ ابھی تک ہم اپنے مدارس میں صحیح زنانہ ماحول پیدا نہیں کر سکے اور نہ اب تک ہمیں صراحت اور وضاحت کے ساتھ یہ معلوم ہی ہے کہ لڑکیوں کے لیے مقاصدِ تعلیمی

گیا ہوں۔

اس سوال کا جواب آسان نہیں اور آج سررشتۂ تعلیم اور عام ماہرانِ تعلیم محتاج ہیں کہ والدین، مدرسین، ہماری بہنیں اور ہمارے بھائی سماجی ضروریات کا اعلان کریں اور سررشتۂ تعلیم اور ماہرانِ تعلیم سے مطالبہ کریں کہ ہماری لڑکیوں کی تعلیم کا طور طریق اور نصاب ایسا ایسا ہونا چاہیے۔

لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کیسے ماحول کی ضرورت ہے؟ اس کا جواب سماج سے طلب کیجیے اور سماج کے لیے یہ ممکن ہے کہ انفرادی اور اجتماعی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ بتائے کہ ہمارے ملک کی فلاح ہمارے گھروں کی آسودگی پر منحصر ہے اور ہمارے گھروں کی آسودگی منحصر ہے اوّلاً ہمارے مذہبی جذبات کی درستی اور پرورش پر اور ثانیاً ہمارے اقتصادی حالات کی ساکھ اور بہتری پر۔ ہندوستانی لڑکی کی اقتصادی زندگی بظاہر صاف اور واضح ہے، یعنی، وہ بیٹی کے بعد بیوی اور ماں بن جاتی ہے، لیکن اس وقت جب وہ بیٹی ہے، اس کے لیے اس قسم کی تعلیم ضروری ہے کہ جب وہ بیوی اور ماں بنے، تو سماج اس پر کسی قسم کی سختی نہ کر سکے اور وہ جذباتی اور اقتصادی طور پر اسی درجہ خود مختار ہو، جتنا کہ اس کا شریکِ زندگی مرد خود مختار ہے۔ یہ توازن مشکل ہے اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے یہ راستہ پُرخطر بھی ہے۔ جس میں ہر دم یہ احتمال رہتا ہے کہ آزادی کے بدلے غیر ذمے داری کا شعار نہ ہو جائے۔

اکبرالہ آبادی مرحوم نے اس خطرے کا اعلان اپنی زہر آمیز ہنسی میں اس طرح کیا ہے ؎

حامدہ چمکی نہ تھی جب علم سے بیگانہ تھی   اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

یہ خطرات بجا اور احتیاط ضروری، لیکن عوام الناس ان خطروں کی حدود تک پہنچنے سے ایک گونہ مامون اور محفوظ ہیں، یعنی، اس ابتدائی تعلیم کے دوران میں، جو ہر لڑکے اور لڑکی کا پیدائشی حق ہے اور جس کے ضروری اجزا لکھنا اور پڑھنا ہیں، ان خطرات کا زیادہ ڈر نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں عوام الناس کا جہل اور متوسط طبقے کا تعلیم یافتہ، بلکہ تعلیم زدہ ہونا موجودہ بے چینی کا باعث ہے اور اگر لڑکیوں کی تعلیم کے انتظام کا بھی یہی طور رہا کہ عوام الناس کی لڑکیاں جاہل رہیں اور متوسط طبقہ تعلیم یافتہ نہیں، بلکہ تعلیم زدہ ہو گیا، تو سماج بربادی کے اُس بھنور میں پھنس جائیگی، جس سے نکلنا مشکل کام ہو گا۔

